http://libraryofurdubooks.blogspot.com/
عبداللہ حسین
رات

رات

"شوکی، کہاں چلے جا رہے ہو؟" لڑکی نے پوچھا۔

"کہیں بھی نہیں!" وہ خوش دلی سے بولا۔

"بھئی آہستہ چلو" وہ بولی: میں تھک گئی ہوں۔"

"بہت اچھا۔"

دونوں خاموشی سے چلتے رہے۔

"شوکت۔" وہ پھر بولی: "خدا کے لیے ——"

"ہنہہ۔"

"کہاں جا رہے ہو؟"

"چلے پون کی چا آ آ آل۔" وہ گا کر بولا۔

"شوکی چپ رہو۔" وہ سختی سے بولی: "لوگ سن رہے ہیں۔"

"جگ میں چلے پون کی چا آل ل۔" وہ گاتا رہا۔ رفتہ رفتہ وہ بہت پیچھے رہ گئی۔

پھر ایک جگہ پر اچانک رک کر وہ ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ پاؤں میں الجھتی ہوئی ساری کو دو انگلیوں میں تھامے وہ ہانپتی ہوئی اس کے پاس آ کر رک گئی۔ اس کی ناک کی پھننگ پر پسینے کے قطرے چمک رہے تھے۔

"چلو اب گھر چلیں۔" وہ بولی۔

اس نے مڑ کر غور سے اس لڑکی کو دیکھا، جیسے اسے پہچاننے کی کوشش کر رہا ہو۔

"چلو گھر چلیں۔" وہ سانس روک کر بولی۔

"چلو۔" وہ جیبوں میں ہاتھ ڈال کر پھر چلنے لگا۔

لیکن ان کا فلیٹ پیچھے کی طرف تھا اور وہ آگے کو جا رہے تھے۔ اسی لیے جب وہ بولی تھی : "چلو گھر چلیں" تو اس کی آواز میں ایک انجانے خوف کی لرزش تھی۔ اس لیے کہ وہ یہ جانتی تھی کہ وہ کہاں جا رہے ہیں۔ وہ اتنے عرصے سے اس کی بیوی تھی!

اب یہ اس عظیم الشان ساحلی شہر کا سب سے بڑا بازار تھا جسے وہ پار کر رہے تھے۔ پھر وہ اسے پار کرنے کے بجائے اس کے بیچوں بیچ چلنے لگے۔ وہ بازار میں چلے جا رہے تھے اور دو رویہ بجلی کی ٹیوبوں کی دودھیا سفید ہلکے ابر آلود آسمان کی سی روشنی تھی اور دکانیں اور شوکیس جگمگا رہے تھے اور رکشا اور موٹریں اور گدھے اور ہر طرح کے لوگ ان کے ساتھ ساتھ بازار کے بیچوں بیچ چل رہے تھے۔ اگلے چوک تک پہنچتے پہنچتے اس نے ایک آخری کوشش کی:

"شوکی"، وہ بولی: "ابھی تو چائے پی کر چلے ہیں۔"

"مجھے بھوک لگی ہے۔" اس نے کند آواز میں کہا۔

"گڈو ——— گھر میں اکیلا ہے۔"

"مجھے بھوک لگی ہے۔" اس نے کہا۔

چوک کو پار کر کے وہ دل کشا ہوٹل میں داخل ہوئے اور اپنی مخصوص میز پر پہنچ کر آمنے سامنے بیٹھ گئے۔

"شوکی" وہ بولی: "میری بات سنو۔"

اس نے سر اٹھا کر غور سے اپنی بیوی کو دیکھا۔

"چلو" وہ بولی، "پانی پی کر چلتے ہیں۔"

"چلو" اس نے کہا اور مینو پر جھک گیا۔

"یا بس چائے پی کر ———" لڑکی نے دوبارہ بات شروع کی، مگر اسی دم اس کا وہ انجانا خوف، جس کے باعث کچھ دیر قبل اس کی آواز لرزی تھی اور جو بار بار اس کے حلق میں آ کر اٹک جاتا تھا، یکسر غائب ہو گیا اور اس کی جگہ اتنی ہی قدیم اور اتنی ہی مانوس بدمزگی اور شدید مایوسی نے لے لی۔ (بہت بعد میں جا کر ایک دفعہ اس کو پتا چلا کہ یہ انجانا خوف اس شخص کا نہیں اس جذبے کا تھا۔) اس موڑ سے اس کی آشنائی پچھلے ایک برس سے تھی، جب سے کہ اس کے خاوند کا تنزل شروع ہوا تھا، مگر برس بھر میں ہی اس نے ایک قدیم اور بھرپور جذبے کی شکل اختیار کر لی تھی جس سے کہ اب وہ زندہ رہنے کی قوت حاصل کر رہی تھی، وہ آزردگی جو ہوتے ہوتے ضد بن گئی تھی اور اب اسے سکون بخشنے لگی تھی، جیسے کہ سارے ہٹ دھرم جذبے اپنی اسی خصوصیت کے طفیل کسی نہ کسی حد تک سکون بخش ہوتے ہیں۔

"کیا کھاؤ گی؟" اس نے مینو سے سر اٹھا کر پوچھا۔

"کچھ نہیں۔"

"کچھ بھی نہیں؟" وہ آنکھیں نچا کر بولا: "کچھ نہ کچھ تو کھاؤ میری جان۔"

وہ دوسری طرف دیکھتی رہی۔ صرف اس کے ہونٹ بھنچ گئے اور آنکھوں میں سختی آ گئی۔ چند میزیں چھوڑ کر ایک نوعمر لڑکا، جو انہیں ریستوران میں داخل ہوتے دیکھ کر اپنی کرسی سے تھوڑا سا اٹھ کر پھر بیٹھ گیا تھا، پرجوش لہجے میں اپنے ساتھی سے باتیں کر رہا تھا۔ لیکن وہ ابھی بہت نوعمر تھا اور شاید پہلی بار اتنی خوبصورت لڑکی کو ایسی بیباکی سے اپنی طرف دیکھتے ہوئے پا کر سنسنا

اٹھا تھا اور اس سے آنکھ ملاتا ہوا گھبرا رہا تھا۔ بس چہرہ سرخ کیے زور زور سے باتیں کیے جا رہا تھا اور بار بار کرسی کو گھسیٹ رہا تھا اور بہرحال اتنے فاصلے پہ بیٹھا تھا کہ اس کی آنکھوں کی کشیدگی کو دیکھ نہ سکتا تھا۔

"زرد سیٹ بھی گیا۔" وہ بولی: "زرد چینی کا سیٹ۔"

"کس قدر افسوس کی بات ہے۔" وہ بڑے بڑے نوالے لیتا ہوا بولا: "تھ تھ تھ۔"

"پہلی چیز جو ہم نے خریدی تھی ——" وہ اپنے آپ سے بولی: "شادی کے بعد۔"

"کتنے پیسے ملے؟"

"تم پیٹ بھر کر کھاؤ شوکی۔" وہ بولی: "تمہیں اس سے کیا؟"

"تو کیا بھوکا مرجاؤں؟" وہ غرایا۔

"نہیں" وہ پہلی بار اس سے آنکھ ملا کر بولی: "پیٹ بھر کر کھاؤ۔"

وہ دوبارہ کھانے پر پل پڑا۔ اس کی لمبی لمبی نازک انگلیوں کو سالن میں لتھڑتے اور بڑے بڑے لقموں کو بنتے اور بگڑتے اور اس کے لمبوترے، سرد اور لاتعلق جبڑے کو تیزی سے کام کرتے ہوئے دیکھ کر وہ بددلی سے بولی: "کچھ تو تمیز سے کھاؤ شوکی۔"

"یہ آزاد ملک ہے۔" اس نے جواب دیا: "ہم آزاد ملک کے باشندے ہیں۔" اور کھاتا رہا۔

لڑکی کی آنکھیں سکڑیں، پھر پھیلیں، پھر ان میں وہی کانچ کی سی سختی آ گئی اور وہ دوبارہ منہ پھیر کر نوعمر لڑکے کی طرف دیکھنے لگی۔

آخر وہ سالن بھری انگلیوں کو نیپکن سے پونچھ کر کرسی کی پشت کے ساتھ سیدھا ہو بیٹھا۔ اس کی بیوی نے سفید کھدر کے براق دھلے ہوئے، چرمر کیے

ہوئے، خالی پلیٹ میں پڑے نیپکن کو دیکھا اور انہی ضدی نظروں سے اس پر پھیلے ہوئے لمبے لمبے میلے سرخ اور زرد نشانوں کو دیکھتی رہی۔

پھر اس کا ہاتھ اپنی طرف بڑھتے ہوئے دیکھ کر وہ گود میں پڑے ہوئے پرس کو مضبوطی سے پکڑ کر بیٹھ گئی۔ کچھ دیر تک وہ سیاہ چمڑے کے اس لمبے سے پرس کو اپنی اپنی طرف کھینچتے رہے۔ پھر وہ بھنچے ہوئے ہونٹوں کو نیم وا کر کے دانتوں کے بیچ سے پھنکاری:

"میں دوں گی۔"

وہ آہستہ سے ہنسا: "اچھا۔" اس نے کہا: "تم ہی دو۔" اور ہاتھ کھینچ کر کرسی کی پشت سے لگ کر بیٹھ گیا اور سامنے اس لڑکے کو دیکھنے لگا۔ لڑکی نے مٹھی بھر ریزگاری پرس میں سے نکالی اور پیسے گن کر بل ادا کیا۔ بیرا خاطر خواہ ٹپ نہ ملنے پر اکڑا اکڑا میز صاف کرنے لگا۔ وہ جلدی سے اٹھ کھڑی ہوئی:

"چلو۔" وہ بولی۔

"ذرا رکو۔"

"چلو"۔ وہ بولی۔

دونوں آگے پیچھے چلتے باہر نکل آئے۔ انہیں جاتے ہوئے دیکھ کر نوعمر لڑکا باتیں بند کر کے ذرا سا کرسی سے اٹھا، پھر بیٹھ گیا اور اداس نظروں سے اس وقت تک انہیں دیکھتا رہا جب تک کہ وہ آنکھوں سے اوجھل نہ ہو گئے۔ باہر فٹ پاتھ اور بازار میں برقی ٹیوبوں کی دودھیا سفید، ہلکے ابر آلود آسمان کی سی روشنی تھی اور ستمبر کا موسم تھا اور بھاری، نمدار سمندری ہوا آ آ کر ان کے چہروں سے ٹکرا رہی تھی۔ چاروں طرف انسانوں اور گدھوں اور گاڑیوں کا ہجوم اسی طرح رواں تھا۔ وہ چلتا چلتا جا کر بس سٹاپ پر رک گیا۔

"چلو"۔ وہ بولی۔

وہ پتلون کی جیبوں میں ہاتھ دے کر ہونٹوں سے سیٹی بجانے اور ادھر ادھر دیکھنے لگا۔

"شوکی" وہ ذرا نرمی سے بولی: "پیدل چلتے ہیں۔"

"میں تھک گیا ہوں۔"

لڑکی نے لمبا سانس چھوڑا: اچھا' وہ بولی "بس میں سوؤ گے تو نہیں؟"

"نہیں۔"

تھوڑی دیر کے بعد دو منزلہ بس کو آتے دیکھ کر وہ بچوں کی طرح خوش ہو گئے۔ وہ اس کے آگے آگے اچھل اچھل کر سیڑھیاں چڑھتی ہوئی اوپر کی منزل میں جا کر سب سے آگے والی سیٹ پر بیٹھ گئی۔ بس کی دوسری منزل پر سفر کرنا ان دونوں کو بیحد بھاتا تھا۔ پہلے پہل جب ان کی شادی ہوئی تھی اور اپنے پیارے پرانے شہر کی ساری جگہیں چپہ چپہ پیدل چل کر گھوم چکے تو بس ٹکٹ خرید کر اس کی دوسری منزل میں آگے والی سیٹ پر بیٹھے شہر بھر کی سیر کیا کرتے تھے بیکار میں۔ پھر وہ اپنے شہر کو چھوڑ کر اس شہر میں آ گئے جہاں دو منزلہ بسیں بہت کم تھیں اور صرف چند ایک خاص خاص راستوں پر چلتی تھیں۔

"اب ہم اڑ رہے ہیں۔" وہ خوشی سے بولی۔

"ہاں" اس نے بھی کہا: "اب ہم اڑ رہے ہیں۔"

اب وہ بڑے بازار سے نکل کر ایک بازو کی سڑک پر جا رہے تھے جہاں پر کہ زیادہ تر دکانیں بند ہو چکی تھیں یا ہو رہی تھیں اور دو رویہ تاریکی میں لگے اکا دکا کھلی دکانوں کے روشن پیوند پیچھے کی طرف اڑتے جا رہے تھے۔ فٹ پاتھ اور سڑک پر ملگجی روشنی میں فاصلے کا احساس بڑھ گیا تھا اور ان دونوں کے چہرے' جو پرانے وقتوں کی رہی سہی خوشی سے پل کے پل کو جگمگا اٹھے تھے' اوپر بس کی روشن کھڑکی میں جڑے دور نیچے سائیکل سواروں اور رکشاؤں اور پیدل

چلنے والوں کو پیچھے کی طرف اڑتا ہوا دیکھ رہے تھے۔

"ٹکٹ؟" کنڈکٹر نے پوچھا۔

جب وہ ٹکٹ کے پیسے نکال رہی تھی تو شوکت نے جھک کر اس کے پرس میں نظر ڈالی اور مکاری سے مسکرایا۔ جب کنڈکٹر چلا گیا تو وہ بولی:

"پتا ہے یہ کہاں سے آئے ہیں؟"

"زرد چینی کا سیٹ ——"

"نہیں۔"

"پھر؟"

"اس کے پیسے تو ابھی ملے ہی نہیں۔"

"پھر؟"

"سرخ ساری کے ہیں۔"

"کون سی والی؟"

"جو پارسال عید پر تم نے دی تھی۔"

بس ایک دھچکے سے سٹاپ پر رک گئی۔ انہوں نے اپنے پاؤں کے قریب لگی طاقچی میں سے دیکھا کہ ڈرائیور نے ابن صفی کا ناول پلٹ کر وہاں سے پڑھنا شروع کر دیا۔ جہاں پچھلے سٹاپ پر اس نے چھوڑا تھا۔ چند لوگ اوپر آئے اور ادھر ادھر بیٹھ گئے۔ ڈرائیور نے ناول الٹا کر کے سٹیرنگ کے پاس رکھا اور بس پھر روانہ ہوئی۔

"یہ ساری۔" اس نے ہاتھ بڑھا کر سبز رنگ کی مہین ریشمی ساری کو چھوا: "میں نے ڈیڑھ سو میں خریدی تھی۔"

"شوکی" اس کی آنکھوں کی کانچ کی سی سختی آن کی آن میں غائب ہو گئی اور وہ اس کی طرف جھک کر جذباتی لہجے میں بولی: "یہ اکلوتا تحفہ ہے جو شادی

ے پہلے تم نے مجھ دیا تھا۔"

"میں چھ ماہ تک اس کے لیے پیسے جمع کرتا رہا تھا۔" اس نے کہا: "گھر سے خرچ اتنا کم ملتا تھا۔"

"اور یہ سب سے پہلا تحفہ ہے جو تم نے مجھے دیا تھا۔ یاد ہے؟"

"تمہیں سبز رنگ بھاتا تھا۔"

"اور تمہیں چھوٹے چھوٹے تحفے دینے سے ایسی شرم آتی تھی۔" وہ آہستہ سے ہنسی: "تم مجھے کوئی قیمتی تحفہ دینا چاہتے تھے۔"

"اب بھی۔" اس نے دوبارہ ہاتھ بڑھا کر چھوا: "بالکل نئی ہے۔"

"شوکت ——" وہ دہل کر بولی' پھر اس نے نرمی سے اس کے بازو پر ہاتھ رکھا: "میں اسے کبھی نہیں بیچوں گی شوکی۔"

"اب بھی یہ بالکل نئی ہے۔"

"میں اسے کبھی نہیں بیچوں گی۔" وہ پھر بولی: "شوکی یہ تمہارا سب سے پہلا ——"

"تمہارے پاس اور بھی ہیں۔" وہ یک لخت چڑ کر بولا۔

"کہاں ہیں؟"

"جو ریاض نے تمہیں دی ہیں۔" اس نے کہا: "ہرے رنگ کی سستی سستی۔"

"وہ ——!" اچانک صدمے سے ایک لمحے کو اس کی پتلیاں پھیلیں' پھر اپنی جگہ پر آ گئیں اور وہ اپنے آپ پر قابو پا کر بولی: "وہ بھی گئیں۔"

"کہاں؟"

"جہاں اور سب گیا۔"

وہ سامنے دیکھتا رہا: "ان کا کیا ملا ہو گا۔" اس نے کہا۔

وہ خاموش بیٹھی خفت سے ہونٹ کاٹتی رہی۔

"ہرے رنگ کی سستی سستی۔" اس نے دوہرایا۔

"سستی نہیں تھیں۔"

"ایسا سستا آدمی ہے۔" وہ بدمزگی سے ہنسا: "ہمارا دوست۔"

"شوکت!" وہ کانچ کی سی آنکھیں سکیڑ کر نیچی آواز میں چیخی۔

اس کے بعد دونوں خاموش بیٹھے رہے۔ اگلے سٹاپ پر وہ کلدار گڑیا کی طرح چلتی ہوئی اس کے پیچھے پیچھے سیڑھیاں اتر کر فٹ پاتھ پر آ گئی۔ دونوں ساتھ ساتھ چلتے رہے۔ جب وہ اپنے فلیٹ کی طرف مڑنے لگے تو وہ رک کر بولی:

"شوکت' میں نوکری کرنا چاہتی ہوں۔"

"کہاں؟"

"جہاں بھی مل جائے۔"

"مبارک ہو۔"

پتھر کا اندھا سا زینہ چڑھ کر دوسری منزل پر اس نے اپنے فلیٹ کے دروازے کو چابی لگائی اور وہ اندر داخل ہوئے۔ بڑے سے کمرے کا فرش اور دیواریں ننگی اور کھڑکیاں بند تھیں۔ دیوار کے ساتھ ایک میز پر چند کتابیں پڑی تھیں اور ٹیبل لیمپ جل رہا تھا۔ فرش پر دو تین کھلونوں کے درمیان ایک بچہ سو رہا تھا۔ اندر داخل ہوتے ہی وہ بھاگ کر گئی اور اس کے اوپر جھک گئی۔ بچے کے میلے گالوں پر آنسوؤں کی لکیریں بنی تھیں۔ اس نے اس کا ماتھا چھوا' پھر گال پر ہاتھ پھیرا' پھر احتیاط سے بازوؤں میں اٹھا کر اسے چوما اور دوسرے کمرے میں لے گئی۔ وہ کمرے کے وسط میں کھڑا خالی خالی اکتائی ہوئی نظروں سے ادھر ادھر دیکھتا رہا۔ پھر اس نے انتہائی آلکس کے ساتھ وہیں کھڑے کھڑے اپنے کپڑے

اتار اتار کر فرش پر گرانے شروع کیے۔ جب سارے کپڑے اتار چکا تو دوسرے چھوٹے کمرے میں جا کر بستر پر لیٹ گیا۔ ایک چھوٹے سے بستر پر بچہ سو رہا تھا۔ دیوار کے ساتھ چند صندوق رکھے تھے۔ دو چار کھونٹیاں تھیں جن پر کپڑے ٹنگے تھے۔ ایک میز تھی جس پر ہینڈ بیگ پڑا تھا۔ دیوار پر بلب جل رہا تھا۔ وہ کتنی ہی دیر تک چھوٹے بستر پر بیٹھی بچے کے جسم پر ہاتھ پھیرتی رہی۔ پھر اس نے اٹھ کر ساری اتاری اور اسے احتیاط سے تہہ کر کے میز پر رکھا' پھر دونوں کمروں کی بتی بجھانے اور سڑک پر کھلنے والی کھڑکی کو کھولنے کے بعد خاموشی سے جا کر اس کے برابر لیٹ گئی۔

ایک پتنگا بڑی دیر سے کھڑکی کے شیشوں پر سر مار رہا تھا اور اندھیرے میں اس کے پروں کی کند' مدھم آوازیں اور سوتے جاگتے ہوئے انسانوں کی سانسوں کی پھنکار ابھر رہی تھی۔ کبھی کبھی کوئی گاڑی مدھم سی روشنی پھیلاتی ہوئی سڑک پر سے گزر جاتی۔

"اوں ہنک!" پھر وہ بولی: "نہیں۔"

وہ بلے کی طرح حلق میں غرایا۔

"نہیں شوکی" وہ پھر بولی: "میرا جی نہیں۔"

"فاختہ۔" وہ خوشامد کے لہجے میں بولا: "میری ننھی سی' پیاری سی فاختہ!"

"خدایا۔" اس نے زاری کی: "خدایا۔"

پھر پتنگے کو شاید باہر جانے کا راستہ مل گیا اور اندھیرے میں صرف سانسوں کی مدھم پھنکار رہ گئی جو بلند ہوتی ہوتی کچھ دیر کے بعد ماتمی سرد آہوں میں تبدیل ہو گئی۔ کمرے میں سخت حبس ہو گیا۔

پھر وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ چند لمحے تک کمرے کے وسط میں بازو لٹکائے کھڑا

رہنے کے بعد وہ اندھیرے میں چلتا ہوا بڑے کمرے میں گیا اور ٹیبل لیمپ جلا کر کرسی پر بیٹھ گیا۔ کہنیاں میز پر رکھے اور بازو سیدھے میز پر پھیلائے اور سفید کاغذ پر نظریں جمائے وہ دیر تک وہیں بیٹھا رہا۔ اب اس کے بدن میں مکمل امن تھا۔ ایک ایک جوڑ ایک ایک پور ایک ایک نس اپنی اپنی جگہ پر عین فٹ ٹھیک ٹھاک بیٹھی تھی اور خون یوں دوڑ رہا تھا جیسے کسی جدید ترین سٹریم لائینڈ مشین میں تیل ایک سرے سے دوسرے سرے تک دوڑتا ہے اور سانس یوں چل رہی تھی جیسے نیم کے پیڑ میں ہوا ایک ایک پتی' ایک ایک ریشے سے لپٹتی ہوئی بڑی روانی سے نکلتی چلی جاتی ہے۔ وہ ایک ذہین آدمی تھا اور ابھی ابھی ایک اٹکلپول کی سی تندی سے اپنی بیوی کے ساتھ محبت کر چکا تھا۔ اور بڑی آسانی سے اپنے آپ کو سنبھالے بے دم ہوا بیٹھا تھا اور خیالات بغیر کسی دقت کے بغیر کسی کوشش یا ارادے ہی کے آپ سے آپ ذہن میں آتے چلے جا رہے تھے۔

"اب میں لکھوں گا۔" اس نے سوچا۔ وہ ہمیشہ یہی سوچتا تھا اور کاغذ سفید کا سفید رہتا تھا۔ اس لئے کہ دل کی سوزش ابھی باقی تھی۔

پھر متوحش آنکھوں سے وہ دروازے میں نمودار ہوئی اور ہولے ہولے چلتی ہوئی آ کر میز کے ایک کونے پر بیٹھ گئی اور اسے دیکھنے لگی۔ اور اسے اس کا ایک سال پہلے تک کا سنگ مرمر کی چمک والا تیر کی طرح سیدھا دبلا پتلا مگر رگ و ریشے والا' پھڑکتے ہوئے' اچھلتے اور کودتے ہوئے پٹھوں والا اور پوری طرح احاطہ کرتی ہوئی گردش والا اور نو عمر لڑکوں کی سی گریس والا محبوب اور مہربان بدن یاد آیا جو اب تند خو اور زہریلا ہو چکا تھا اور کوئی رابطہ کسی سے نہ رکھتا تھا اور مشین کی طرح سرد مہر تھا۔ پھر اس نے بھی آنکھیں اٹھا کر اس کی طرف دیکھا اور دیکھتا رہا۔

زرد رنگ کی دیوار کے ساتھ ذرا سی ٹیک لے کر بیٹھی ہوئی وہ "رینوا" کی

رس بھری، شاداب بدن کنواریوں کی یاد دلاتی تھی اور کوئی نہ کہہ سکتا تھا کہ اس عورت نے ایک بچہ جنا ہے اور دو سال تک اسے دودھ پلاتی رہی ہے۔ ٹیبل لیمپ کی گلابی روشنی میں اس کا انگ انگ جما ہوا بدن، بڑی اٹھان والا اور بڑے جھکاؤ والا اور بڑا پراسرار بدن مدھم مٹیالے سے زرد رنگ کا تھا اس طرح کہ دیوار کے ساتھ ایک ہو گیا تھا اور دیوار سے الگ بھی تھا اس وقت اس گونگے اور بہرے اور بے خیال بدن، اس عاجز اور لاوقت بدن، اور باوجود ان سب کے بڑے ہی زرخیز اور تقریباً جلا وطن بدن کو دیکھ کر اس کے دل میں افسوس پیدا ہوا۔ اور اس وقت اسے ماضی کی یاد آئی۔

اس لئے کہ ماضی کا بھی اپنا ایک رنگ تھا، مدھم مٹیالہ زرد سا رنگ جو ان ساری چیزوں کا رنگ تھا جو ماضی میں رہتی تھیں ——— بہت پہلے جب وہ چھوٹا سا لڑکا تھا اور سویرے سویرے اٹھ کر سکول کو جایا کرتا تھا اور نوکر ساتھ ساتھ بستہ لئے ہوتا تھا اور بستہ باندھنے کے بھی دو طریقے تھے۔ ایک دو گانٹھ والا تھا اور ایک ایک گانٹھ والا۔ یعنی دائیں بائیں کے پلوؤں کو بھی گانٹھ دیتے تھے اور آمنے سامنے کے پلوؤں کو بھی گانٹھ دیتے تھے اور یہ ایک طریقہ تھا۔ یا پھر آمنے سامنے کے پلوؤں کو نیچے اوپر تہہ کر کے رکھتے تھے اور دائیں بائیں کے پلوؤں کو اوپر گانٹھ دیتے تھے اور یہ دوسرا طریقہ تھا۔ اور کبھی ایک طرح سے باندھتے تھے اور کبھی دوسری طرح سے، اور جی کرتا تھا خود اٹھاتے تھے جی کرتا تھا نوکر سے اٹھواتے تھے اور اپنی مرضی کے خود آپ مالک تھے اور جو جی میں آتا تھا کرتے تھے۔ یعنی جی میں آتا تھا تو رستے میں رک کر ننھے ننھے رنگ دار کنکر جمع کرنے لگتے تھے اور پھر صاف سی جگہ پر بیٹھ کر ان کا نشانہ کرتے تھے اور نوکر کہے جاتا تھا: "بھیا اسکول کو دیر ہو جائے گی۔ بھیا پھر خاں صاحب ناراض ہوں گے۔" اور اس کی بات کو ایک کان سے سن کر دوسرے کان سے اڑا دیتے تھے کہ اس

کی اپنے سامنے کوئی طاقت نہ تھی۔ پھر وہ رستے میں نیم کا ایک پیڑ پڑتا تھا کہ جس پر چڑھتے ہوئے جانا گویا فرض تھا۔ اس لئے کہ اس کی بے شمار شاخیں تھیں جن پر چڑھنا بڑا آسان تھا اور اوپر ان گنت پتیاں تھیں ہوا جن کے بیچ سے ہو کر بڑی آسانی اور روانی سے چلتی تھی اور دو موٹی موٹی شاخوں پر پیر جما کر پتوں کے اندر ہوا کے رخ منہ کر کے کھڑے ہونا بڑا ہی اچھا لگتا تھا۔ پھر ایک روز آتا تھا کہ بقرعید ہوتی تھی اور اب تو گرمیوں میں آتی ہے مگر تب بڑے جاڑوں میں آیا کرتی تھی اور رات بھر مہندی لگے، اخبار کے کاغذوں میں لپٹے ٹنڈ منڈ ہاتھوں کو گود میں دیئے کبھی جاگے کبھی سوئے رہتے تھے اور سویرے اٹھ کر دانتوں سے تاگوں کو کھولتے اور کاغذ اتارتے تھے تو سوکھی مہندی کے پپڑے نیچے گرتے تھے اور انگلیاں سیدھی نہ ہوتی تھی۔ مگر جب پانی میں ڈال کر ہاتھوں کو دھوتے تھے تو ان کا آتشی گلابی اور سرخ رنگ نکلتا تھا جو فخر سے ایک دوسرے کو دکھاتے تھے اور ثابت کرنے کی کوشش کرتے تھے کہ ہمارا سب سے شوخ رنگ نکلا ہے۔ پھر اس کمرے میں جاتے تھے جہاں صندوق پڑے ہوتے تھے اور جہاں رات کو مہندی لگانے اور سونے سے قبل سب کے عید کے نئے سلے ہوئے جوڑے نکال نکال کر بکسوں، صندوقوں اور پیٹیوں پر پھیلا دیئے گئے ہوتے تھے۔ نہانے سے پہلے ایک نظر اور ان کو ضرور دیکھ لیتے تھے۔ پھر نہا دھو کر اور نئے کپڑے پہن کر ابا کے ساتھ نماز کو جاتے تھے۔ نماز کے بعد گھر آ کر صرف عیدی لینے کو رکتے تھے اور گلیوں میں بھاگتے ہوئے ماموں کے گھر پہنچتے تھے جہاں سے الگ عیدی لیتے تھے۔ پھر وہاں سے میلے کا رخ کرتے تھے۔ میلے پر میٹھی املی کھاتے تھے اور جھولوں پر خوب ایک دوسرے سے لپٹ کر آنکھیں میچ کر بیٹھتے تھے اور گھر واپس آتے آتے ابا کے نام کا بکرا ذبح بھی ہو چکا ہوتا تھا۔ مگر اصل بات تو اگلے روز ہوتی تھی جب سویرے سویرے منہ اندھیرے ابا میاں آ

کر جگا دیتے تھے اور صبح سویرے یوں جگا دیئے جانے پر دل بڑا خفا ہوتا تھا اور گرم گرم بستر ہی میں کسمسا کر سو جاتے تھے۔ مگر ابا میاں تھے کہ ننگی چھری ہاتھ میں لیے کھڑے رہتے اور کہے جاتے: ”شوکی بیٹا‘ بس ذرا اس کو ہاتھ لگا دو۔ شوکی بیٹا —— پھر جب آنکھیں مل کر کھولتے تو صبح سویرے کی ملگجی روشنی میں چمکتی ہوئی چھری کو دیکھ کر چونک پڑتے اور اٹھ کر بیٹھ جاتے اور ڈرتے ڈرتے ہاتھ بڑھا کر اسے ذرا سا چھو دیتے اور ابا میاں اسے پکڑے پکڑے باہر چل دیتے۔ مگر نیند اس کے بعد نہ آتی۔ چنانچہ مفلر کانوں پر لپیٹ کر‘ ہاتھ بغلوں میں دے کر سردی کے مارے کپکپاتے ہوئے ابا کے پیچھے پیچھے نکل آتے۔ باہر صبح کی روشنی اچھی خاصی ہوتی اور وہ نظارہ ہوتا‘ وہ جو دیکھنے کی ہمت نہ پڑتی مگر دیکھے جاتے۔ قصائی بکرے کو نالی پر گرائے اسی چھری سے ذبح کر رہا ہوتا اور ابا پاس کھڑے ہوتے اور خود ابا کے پیچھے چھپے ایک آنکھ نکال کر سرخ سرخ گاڑھے خون کو بہہ کر نالی میں جاتے‘ اور زمین پر ٹانگیں چلاتے پھڑکتے‘ کپکپاتے اور کٹے ہوئے حلق سے گرر گرر کی آواز نکالتے اور پھٹی پھٹی آنکھوں سے آسمان کو تکتے ہوئے بکرے کو دیکھے جاتے دیکھے جاتے اور دل میں بیک وقت خوف زدہ اور بڑا ہی اچھا محسوس کرتے —— اب یہ ساری چیزیں مدھم سے مٹیالے سے زرد رنگ کی تھیں اور ماضی کی اس عجیب و غریب سرزمین پہ رہتی تھیں جہاں سے اس کو دیس نکالا مل چکا تھا۔

پھر ایک روز پتا چلا کہ ابا فوت ہو گئے۔ ان کا لمبا سا تابوت صحن میں رکھا تھا اور گھر میں رونے چلانے کی آوازوں کے باوجود عجیب سی گونجتی ہوئی خاموشی تھی۔ ایک بڑی عجیب بات یہ تھی کہ اب تک ابا کے بارے میں اس کی یاد صرف اس تابوت کے حوالے سے تھی۔ جب بھی ابا کا ذکر آتا یا ان کی یاد آتی صرف وہ تابوت آنکھوں کے سامنے آتا اور وہ نہ آتے۔ اب یہ ساری باتیں

بھی اسی زرد سے رنگ و بو کی مالک تھیں۔

پھر سب کچھ ختم ہو گیا۔ پھر وہ اچانک غریب ہو گئے۔ پھر وہ نوکر اور اپنے سامنے اس کی کم مائیگی کا احساس اور وہ لاپروائی اور بقر عید کے بقر عید وہ دلدوز نظارہ —— کچھ بھی باقی نہ رہے اور وہ آہستہ آہستہ بڑا ہونا شروع ہوا۔ اس کی سمجھ میں کچھ بھی نہ آیا۔

”جال“ اس نے پہلی بار بیوی کا نام لے کر نرمی سے کہا: ”کپڑے پہن لو۔“

وہ اٹھی اور اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولی: ”چلو۔“

انہوں نے دونوں کمروں کی بتیاں گل کیں اور ساتھ ساتھ لیٹ گئے۔

اب چاروں طرف تاریکی تھی اور جس سے دم گھٹا جا رہا تھا اور اسے پھر ماضی کی یاد آئی‘ کہ ماضی ایک وسیع و عریض‘ آسودہ حال اور زرد رنگ کی روشن سرزمین تھی جیسے صبح ہوتی ہے۔ اور ایک وہ لڑکی تھی گلی کے موڑ پر جس کا گھر تھا اور جس سے اس کی بڑی گہری نسبت تھی۔ ایسے کہ دونوں ساتھ ساتھ سکول کو جاتے تھے اور وہ چھٹے درجے میں تھا اور وہ پانچویں میں تھی اور کبھی ایک کے گھر میں اور کبھی دوسرے کے گھر میں دونوں پہروں مل کر کھیلتے رہتے تھے۔ اس کی جلد گائے کے مکھن کی سی اسی ہلکے زرد رنگ کی تھی اور اسی طرح ملائم اور چکنی اور بے داغ تھی۔ جب وہ ہنستی تھی تو اس کے گالوں میں گڑھے پڑتے تھے اور آنکھوں میں جگنوؤں کی قطاریں چلتی تھیں اور گلے سے گھنٹیوں کی آواز آتی تھی۔ اور وہ ہمیشہ سر پیچھے پھینک کر ہنستی تھی۔ اس کا نرخرہ اوپر نیچے کانپتا رہتا تھا اور اس کا جی بے اختیار اسے چھونے کو کرتا تھا۔ پہروں تک وہ اس کے گلے پر اور گلے سے نیچے سینے کی جلد پر اور بازوؤں پر انگلیاں دوڑاتا گدگدی کرتا نہ تھکتا تھا اور جب گھر کو لوٹتا تھا تو ہر روز بہت اداس ہو جاتا تھا۔ وہ ہر دم ہنسا کرتی

تھی اور اسی طرح ایک روز ہنستے ہنستے بولی تھی: "میرا پیٹ دیکھو گے؟" اور کپڑا ہٹا کر کھڑی ہو گئی تھی اور نیچے اس کا پیٹ بہت چپٹا، کمر کے ساتھ لگا ہوا، سنہرے زرد رنگ کا ملائم اور بے داغ تھا اور ناف کے اندر ہلکا سا سایہ تھا۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر اس کے پیٹ پر رکھ دیا تھا اور رکھے رہا تھا اور وہ کھڑی رہی تھی چپ چاپ۔ پھر اچانک اس نے پیٹ سے ہاتھ اٹھا کر اس کی قمیض پر رکھ دیا۔ : "اسے اتار دے۔" اس نے کہا تھا: "اور اسے بھی۔" وہ اس کے دوسرے کپڑے کو چھو کر بولا تھا: "تیرا بدن دیکھوں گا۔" اور اسی طرح ہنسی سے دہری ہوتے ہوئے اس نے کپڑے الگ کر دیئے تھے اور ہاتھ آگے باندھ کر اس کی طرف پیٹھ کر کے کھڑی ہو گئی تھی اور خاموش ہنسی سے سارے بدن میں کپکپاتی رہی تھی، کپکپاتی رہی تھی۔ اور سحر زدہ سا بیٹھا بیٹھا اس کے لمبی لمبی ٹانگوں والے اور تنگ محراب کولہوں والے اور کمان کی طرح تنی ہوئی ریڑھ کی ہڈی والے اور دبلے پتلے شانوں والے اور سنہری سنہری روئیں والے ہلکے زرد بے داغ اور نو عمر بدن کو دیکھتا رہا تھا اور اس کا اپنا بدن ایک دم ہلکا سا ہو گیا تھا جیسے کہ وہ ابھی اوپر اٹھ کر اڑنے لگے گا اور اسے دل میں بڑا ہی اچھا لگا تھا۔ اور یوں اس لڑکی کا یہ روپ اس کے دل پر نقش ہو کر رہ گیا تھا۔ اس کے بعد جب بھی اس کا ذکر آیا یا اس کی یاد آئی اس کا یہی روپ نظر کے سامنے آیا وہ نہ آئی۔ ماضی کے نخلستان میں اس نیم کے پیڑ اور اس لڑکی کی ایک ہی رنگ و بو تھی کہ دونوں دل کو ہلکا کرتے تھے اور بدن میں اڑان پیدا کرتے تھے اور جی کو بڑے ہی اچھے لگتے تھے۔

جس روز رات کو ہیضے سے وہ مری ہے اسے کچھ پتا نہیں چلا۔ سویرے گھر میں کسی نے اس سے ذکر نہیں کیا۔ صرف ان کے گھر کے آگے سے نکلتے ہوئے اس نے ایک ہنگامہ سا دیکھا اور بے سوچے سمجھے سکول چلا گیا۔ پھر آدھی

چھٹی کے وقت میں وہ اسے سارے میں ڈھونڈتا پھرا اور اسے کہیں نہ پا کر سخت مایوس ہوا۔ جب وہ سکول سے لوٹا تو وہ اسے دفنا کے بھی آ چکے تھے۔ وہ ان کے گھر بھر میں پھرتا رہا اور کسی نے اس کی طرف دھیان نہ دیا۔ پھر وہ ان کے کوٹھے پر جا چڑھا اور اس جگہ جا کر بیٹھ گیا جہاں اس نے اس کا وہ روپ دیکھا تھا۔ بڑی دیر کے بعد وہ وہاں سے اٹھا اور چوبارے کی کھڑکی سے سر نکال کر بے مدعا ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ اس وقت اس کی نظر اپنے مکان پر پڑی اور وہ حیران رہ گیا۔ اس نے بارہا یہاں سے اپنے مکان کو دیکھا تھا مگر پہلے کبھی اسے اس کی خستہ حالی کا ایسا احساس نہ ہوا تھا۔ ان کا مکان دھوئیں کے رنگ سے بدرنگ ہو رہا تھا اور اس پر بارش کے پانی کی لکیریں بنی ہوئی تھیں اور چوبارے کی ایک دیوار ٹوٹی ہوئی تھی اور اینٹیں ادھر ادھر بکھری پڑی تھیں۔ اس وقت اس نے دل میں ارادہ کر لیا کہ بڑا ہو کر وہ ایک امیر آدمی بنے گا۔

اپنی بیوی کے پیٹ پر ہاتھ رکھے رکھے وہ سو گیا۔

اگلے روز سویرے وہ ریاض کے چمکتے ہوئے دفتر میں بیٹھی تھی۔ وہ آگے کو جھک کر تقریباً کرسی کے کنارے پر بیٹھی تھی اور ساتھ والی کرسی پر اس کا بچہ بیٹھا پاؤں ہلا رہا تھا اور چھت کو گھور رہا تھا۔ سامنے ریاض گھومنے والی کرسی پر بیٹھا اپنی وسیع و عریض میز کے شیشے پر کہنیاں رکھے بالوں میں انگلیاں پھیر رہا تھا۔

"شوکت کیسا ہے؟" اس نے پوچھا۔

"ٹھیک ہے۔" وہ آہستہ سے بولی۔

"ٹھیک ہے؟"

وہ بے دلی سے اپنے ناخنوں کو گھورتی رہی۔

"انکل۔" بچے نے کہا: "میں پڑھوں گا۔"

"کہاں پڑھو گے گڈو؟"

"کہاں؟" بچے نے کہا: "کتاب پڑھوں گا۔"

"ہاہا۔" ریاض ہنسا: "ابھی تو تم بہت چھوٹے ہو بیٹے۔"

"میں چار سال کا ہو گیا ہوں۔"

"ہاں ہاں۔" اس نے میز کی دراز سے چند اور ٹافیاں نکال کر بچے کو دیں جو وہ لے کر کھانے لگا۔

"ریاض" وہ اور آگے کو جھک کر بولی: "میں نوکری شروع کرنا چاہتی ہوں۔"

"کہاں؟"

"جہاں بھی مل جائے۔"

وہ بڑی دیر تک اسے گہری نظروں سے دیکھتا رہا، پھر بولا: "تم میرے ساتھ کام کر سکتی ہو، چاہو تو۔"

"نہیں۔" وہ بولی: "اپنی پرانی جگہ کا پتا کرتی ہوں۔"

"کالج میں؟"

"ہاں۔"

"وہ ابھی تک خالی تھوڑا ہو گی۔" اس نے کہا: "دو سال ہو گئے۔"

"شاید ہو۔"

"امی۔" بچے نے کہا: "مجھ کو کتاب لے کر دو۔"

"اچھا۔"

"ڈی ڈل ڈی ڈل ڈی ڈل ڈو۔"

"گڈو۔" وہ بولی: "خاموش بیٹھو بچے۔"

"انکل مجھے کتاب لے کر دو۔"

"ابھی لے کر دیتے ہیں بیٹے۔"

پھر وہ اٹھا اور میز کے نچلے دراز سے ایک چوڑا سا نفاست سے بندھا ہوا پیکٹ نکال کر اس کی طرف بڑھا۔

"نہیں ریاض۔" وہ دہل کر بولی: "نہیں۔"

"جال ——"

"نہیں ریاض۔ اسے اپنے پاس رکھو۔"

"مگر آخر کیوں —— جال؟"

وہ اپنے سامنے میز پر پڑے پیکٹ کو گھورتی رہی۔ پھر آہستہ سے بولی:

"ریاض اسے پتا چل گیا ہے۔"

"کس بات کا؟"

"ساری ساریاں جو تم نے مجھے دی ہیں۔"

"میں نے اس سے چوری تو نہیں دیں۔"

"میں نے اسے کبھی نہیں بتایا بہرحال۔"

"بہرحال۔" وہ لاپروائی سے بولا: "کیا فرق پڑتا ہے۔ آخر میں تم سے اتنی ——"

"ریاض ——" وہ جیسے اپنے بچاؤ کے لئے ہاتھ اٹھا کر بولی۔

"اچھا چلو نہ سہی۔" وہ ہنسا: "مگر ہم اتنے پرانے دوست تو ہیں کم از کم ——"

"ریاض۔" وہ بولی: "خدا کے لئے ——"

وہ اٹھ کر آفس میں پھرنے لگا۔

"امی۔" بچہ پیکٹ سے کھیلتا ہوا بولا: "یہ کیا ہے؟"

"کچھ نہیں ہے۔"

"ڈی ڈل ڈی ڈل ڈو ڈل ڈا۔"

"گڈو چپ رہو۔"

"جال۔" وہ آ کر اس کے قریب میز پر بیٹھ گیا: "صرف ایک سال پہلے تک تم کتنی خوش تھیں، یاد ہے؟ میں تمہیں دیکھتا تھا تو میرے دل میں روشنی ہو جایا کرتی تھی۔ میں تمہیں کھو چکا تھا مگر خوش تھا، اس لئے کہ تم خوش تھیں۔"

"ریاض!"

وہ پھر اٹھ کر کمرے میں پھرنے لگا: "جال، آخر ہوا کیا ہے؟ بتاؤ۔ آخر ——ہوا ——کیا —— ہے؟"

"مجھے کچھ پتا نہیں ریاض۔" وہ مایوسی سے سر ہلا کر بولی۔

"وہ ایک سیدھا سادہ نارمل اور ذہین انسان تھا، اور ——" وہ اداسی سے بولا: "بڑا خوش بخت آدمی تھا۔ ہم ساری عمر سے اسے جانتے آئے ہیں، اس کے ساتھ رہے ہیں، پھر یہ بیٹھے بٹھائے اس کو آخر کیا ہو گیا ہے۔ جال، مجھے شک ہوتا ہے کہ تمہیں سب پتا ہے مگر مجھ سے چھپاتی رہی ہو۔"

"مجھے کچھ پتا نہیں ریاض۔" وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی: "میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔ ہر وقت کھاتا رہتا ہے یا سویا رہتا ہے یا مسخرے پن کی حرکتیں کرتا رہتا ہے۔ میں سویرے سے شام تک باتیں کرتی ہوں اور میری کوئی بات نہیں سنتا، کسی بات کا جواب نہیں دیتا۔ جو پیسے ہوتے ہیں ضائع کر دیتا ہے، اور ——" اس نے اس کی تند، حیوانی محبت کا ذکر کرنا چاہا مگر رک گئی: "گھر میں کچھ بھی نہیں رہا۔" آخر وہ بولی۔

ریاض چلتا چلتا کھڑکی کے آگے رک گیا۔ پھر اس نے کھڑکی کھولی اور دونوں ہاتھ اس پر رکھے رکھے نیچے سڑک پر دیکھتا ہوا بے خیالی سے بولا: "جال یاد ہے وہ دن جب یونین کے الیکشن میں اس نے مجھے ہرایا تھا؟ اس روز ووٹنگ

کے نتائج بر آمد ہونے پر اس نے بڑی فراغ دلی سے میرے سامنے آ کر مصافحے کو ہاتھ بڑھایا تھا اور میں نے منہ پھیر لیا تھا۔ تم سٹاف روم کے سامنے کھڑی ہمیں دیکھ رہی تھیں۔"

وہ خاموش بیٹھی میز کے شیشے پر ناخن سے لکیریں کھینچتی رہی۔

"بعد میں جب میں جھنڈیاں لگے ہال میں تنہا رہ گیا اور سب لوگ اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے اور شکست کی بہت ساری خفت میرے دل سے نکل گئی تو بڑے زور کی آندھی آئی تھی اور میں نے برآمدوں میں اڑتے ہوئے اپنے اور اس کے پوسٹروں کو دیکھ کر سوچا تھا: "یہ شخص واقعی تمہارے قابل ہے۔" اس روز میں اپنی زندگی کے اس موڑ پر آ گیا تھا جہاں سے پھر کبھی واپسی نہیں ہوئی۔ اس روز اس نے ہمیشہ کے لئے تمہیں مجھ سے جیت لیا تھا۔

"ریاض۔" وہ بولی: "ان باتوں کو یاد کرنے سے اب کیا فائدہ؟"

"تمہیں پتا ہے جال۔" وہ مڑ کر دیوار کے سہارے کھڑا ہو گیا: "نوجوانی کے دلیر دنوں میں گرا ہوا آدمی پھر کبھی جم کر کھڑا نہیں ہوتا۔"

وہ جھلملاتی ہوئی آنکھوں سے اسے دیکھتی رہی۔

پھر وہ آہستہ سے ہنسا اور آ کر اپنی کرسی پر بیٹھ گیا۔

"مگر یہ بات۔" اس نے ہوا میں ہاتھ پھیلا کر سوال کیا: "میرے لیے اب ایک راز بن چکی ہے۔ کوئی واقعہ، کوئی حادثہ، کچھ بھی تو نہیں ہوا، پھر یہ اسے کیا ہو گیا ہے؟ کیا ہو گیا ہے جمال؟"

"مجھے کچھ پتا نہیں۔" وہ رو کر بولی: "مجھے کچھ پتا نہیں۔"

"امی۔" بچے نے کہا: "امی۔" پھر اس نے کہا: "انکل۔" کسی نے اس کی طرف توجہ نہ دی۔

پھر وہ آنکھیں خشک کر کے اٹھ کھڑی ہوئی۔

"میں ذرا کالج تک جا رہی ہوں۔" وہ بولی: "گڈو کو یہاں چھوڑے جاتی ہوں۔" وہ جھک کر بچے کے بال سیدھے کرتے ہوئے بولی: "گڈو جی، میں ابھی تھوڑی دیر میں آ جاتی ہوں۔ آپ انکل کے پاس ٹھہریئے۔ اچھا؟" اور اسے ماتھے پر چوم کر باہر نکل گئی۔

پیچھے گھر میں جب وہ سو کر اٹھا تو میز پر اس کا ناشتہ ڈھکا پڑا تھا اور کھڑکی کے راستے اتر آتی ہوئی دھوپ اس پر پڑ رہی تھی۔ اس نے اٹھ کر کلی کی اور ناشتہ کیا۔ پھر وہ ہاتھ سر کے پیچھے باندھ کر سیدھا لیٹ گیا اور کمرے میں داخل ہوتی ہوئی دھوپ کی اس چوڑی سی شعاع کو دیکھنے لگا جس میں گرد کے ذرات معلق تھے۔ گرد کے ذرات والی دھوپ کی شعاعوں کو دیکھنا اس کا محبوب مشغلہ تھا۔ اس سے اسے بدن کے ہلکے پن کا احساس ہوتا تھا جس سے پھر اڑان کی یاد آتی تھی۔ سو کر اٹھنے کے بعد جو آسودگی کا مختصر سا وقفہ آتا تھا اس میں اس نے ناشتہ کیا تھا، اور کھانے کے بعد جو ایسا ہی تھوڑا سا وقت ملتا تھا اس میں وہ پھر سونے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس نے کروٹ لی اور دیوار کی طرف منہ کر کے لیٹ گیا۔ دیوار مٹیالے سے زرد رنگ کی تھی۔ سونے سے پہلے اس نے پھر اس زرد روشن رنگ کو یاد کیا۔ اب اس رنگ کی ایک بو بھی تھی: تازہ شہد کی سی، شیریں کے زرد باریک تاروں والے پھولوں کی سی، جو گرمیوں کی شاموں کو کسی سڑک پر چلتے چلتے اچانک ناک میں داخل ہوتی تھی اور پتا چلتا تھا کہ یہاں پاس ہی کہیں شیریں کا پیڑ ہے، یا شاید سنتھے کی خشک جڑوں کو پانی دیا جا رہا ہے —— یا کہ صرف ماضی ہے!

پرانے آبائی شہر میں اس کی اونچے اونچے دبلے پتلے سرو کے پودوں اور گھاس کے وسیع و عریض قطعوں والی یونیورسٹی تھی جس کی پرانی پرانی کائی جمی،

عشق پیچاں کی بیلوں سے لدی عمارتیں تھیں جن کے موٹے موٹے چوکور ستونوں والے برآمدے تھے اور چوڑے چوڑے، پتھر کی سیڑھیوں والے زینے تھے اور اونچی اونچی چھتوں والے کمرے تھے اور ہر عمارت کا اپنا ایک مینار تھا جس کے اندر بل کھاتا ہوا تنگ سا زینہ چڑھتا تھا جو اوپر برجی میں جا کر نکلتا تھا جس کا دروازہ ہمیشہ بند رہتا تھا۔ پھر جب اس روز ففتھ ایئر کیمسٹری کے اس کھوئی کھوئی آنکھوں والے خوبصورت سے طالب علم نے ایک دروازہ توڑ کر برجی سے چھلانگ لگا کر خودکشی کر لی تو ساری برجیوں کے دروازوں پر پلستر کروا دیا گیا تھا اور اس نے یونیورسٹی میگزین میں اس موضوع پر ایک کہانی لکھی تھی جس کا بڑا چرچا ہوا تھا اور اسی واقعے پر اس نے یونیورسٹی کے نامہ نگار کی حیثیت سے شہر کے سب سے بڑے اخبار میں ایک زبردست مضمون لکھا تھا جس نے اس کی دھاک بٹھا دی تھی۔ وہ یونیورسٹی میگزین کا ایڈیٹر تھا۔ وہ ڈی بیٹنگ ٹیم کا لیڈر تھا۔ وہ شعلہ بیان مقرر تھا۔ وہ چوٹی کا طالب علم تھا۔ وہ یہاں، وہاں تھا اور ہر جگہ تھا۔ اس کی کہانیوں کی ایک دھوم تھی۔ اس کی اور ریاض کی جوڑی یونیورسٹی بھر کی نظروں میں تھی۔ ریاض اول نمبر کا اتھلیٹ، ہاکی ٹیم کا نائب کپتان اور چار سو چالیس گز کی دوڑ کا ریکارڈ ہولڈر تھا۔ اس کی بڑی خوش دل، ہنس مکھ اور لاپرواہ شخصیت تھی۔ ذاتی مقبولیت میں ایک دوسرے کے حریف ہونے کے باوجود دونوں کا آپس میں گہرا یارانہ تھا۔ ریاض کا باپ ایک انگریزی روزنامے کا مالک تھا اور اس نے شوکت کو اپنے اخبار کی پارٹ ٹائم نامہ نگاری دے دی تھی کیونکہ اس کو پڑھائی کے لئے اخراجات کی ضرورت تھی۔ ریاض ہاکی اور دوڑ کی پریکٹس کے بعد شام کو اس کے گھر آ جاتا اور پھر دونوں سائیکلوں پر سوار خبروں کی تلاش میں شہر بھر میں پھرا کرتے اور اجنبی لڑکیوں کا تعاقب کرتے (جان پہچان والی لڑکیوں کے تو وہ ہیرو تھے چنانچہ لیئے دیئے رہتے) ان

دنوں اس کے دو مستقل ٹھکانے تھے: ایک اپنا گھر اور ایک ریاض کا گھر۔ ریاض کے گھر میں اس کی حیثیت کنبے کے ایک فرد کی سی تھی۔ وہ ریاض کی ماں سے بالکل بچوں کی طرح ضد کرتا اور اس کی چھوٹی بہنوں پر بڑے بھائیوں کی طرح رعب گانٹھتا۔ اکثر وہ رات کا کھانا ان کے گھر پر کھاتا اور بعد میں دیر تک ڈائننگ ٹیبل پر بیٹھا ریاض کے باپ کے ساتھ سیاسی معاملات پر پرجوش بحثیں کیا کرتا۔ ریاض بیٹھا اونگھتا رہتا اور بعد میں اس کی پشت پر دھپڑ مار کر کہتا:

"عجب بور آدمی ہو یار۔ جانتے نہیں ابا جان کا بلڈ پریشر پہلے ہی ہائی ہے۔" جس روز ریاض نے یونیورسٹی سپورٹس میں چار سو چالیس گز کی دوڑ کا ریکارڈ توڑا اس نے تین روز لگا کر ایک نوٹ لکھا تھا جو میگزین میں ریاض کی تصویر کے نیچے چھپا اور جس کا شکریہ ادا کرتے کرتے ریاض تقریباً رو پڑا تھا۔ پھر اس کے صلے کے طور پر ریاض نے انٹرورسٹی ڈی بیٹ میں اس کی تقریر کے دوران ہوٹنگ بند کرانے کے لئے آدھے ہال سے لڑائی مول لی تھی۔ یہ نوجوانی کا وہ سنہرا زرد اور ہلکا سبز زمانہ تھا جب دل میں زور ہوتا ہے اور نگاہوں میں عزم ہوتا ہے اور آدمی دنیا کی سب سے اونچی چوٹی پر بیٹھا جیسے ہر وقت اڑنے کے لئے پر تول رہا ہوتا ہے۔ جب چھوٹی سے چھوٹی بات بھی —— رات کے سناٹے میں گم ہوتا ہوا کوئی الوداعی قہقہہ، کمر پر پڑتا ہوا پیار بھرا دھپ، ذہنوں کی وہ مخصوص بے تار برقی اور آنکھوں کی وہ مخصوص لمحاتی چمک (جیسے خاموش بیٹھے بیٹھے اچانک ایک ساتھ ایک ہی بات کو یاد کر کے چونک پڑنا اور پھر نظروں کا ملنا اور بالکل ناقابل تشریح طور پر ایکدوسرے کے دل کی بات کو جان لینا اور اطمینان سے خاموش بیٹھے رہنا)، یا باہر برآمدے میں کسی کے مانوس قدموں کی چاپ (جیسے گرمیوں کی لمبی لمبی سہ پہروں میں اکیلے بیٹھے بیٹھے کسی کو یاد کرنا اور دل میں اس کے ملنے کی خواہش کرنا اور اسی وقت بالکل انجانے طور پر اس کا وہاں پہ آ نکلنا)، یا اپنے

پرائیویٹ مذاق (جن کے حوالے سے بھری مجلس میں آپ ہی آپ میں محظوظ ہونا)۔ وہ زمانہ جب یہ چھوٹی چھوٹی باتیں بھی گہری رفاقت کا احساس دلاتی ہیں اور جب صرف دو ایک پسند کے دوست مل جانے پر ہی آدمی کے دل کے سارے جذبے پورے ہو جاتے ہیں اور ہوس کا دور دور تک نشان نہیں ہوتا اور دل شکنی ابھی دل سے بہت دور ہوتی ہے۔ اس زمانے میں وہ اپنی دنیا میں بڑے مکمل اور بہت خوش تھے۔

پھر ہسٹری ڈیپارٹمنٹ میں وہ لڑکی آ کر داخل ہوئی۔ وہ دونوں آخری سال میں تھے کہ ففتھ ایئر ہسٹری میں جمال افروز انصاری آ کر داخل ہوئی جسے سب لوگ پیار سے جال کہتے تھے۔ وہ ہمیشہ سبز ساری پہنتی تھی (سکنڈ ریٹ قسم کے لڑکوں نے اس کا نام سبز پری رکھ چھوڑا تھا) اور بات کرتے کرتے جب ذرا جوش میں آ جاتی تو اپنی بھوری بھوری پلکوں کو سکیڑ کر بڑے جلال سے بات کرتی تھی۔ اس کا یہی انداز تھا جس نے اسے ایک بڑی اچھی ڈی بیٹر بنا دیا تھا۔ وہ اسے بہت پہلے سے جانتے تھے، جب وہ دونوں ابھی انٹر میں تھے اور وہ اپنے گرلز کالج کی طرف سے ایک مباحثے میں شرکت کرنے کے لئے آئی تھی۔ ان دنوں میں بھی وہ سبز لباس میں تھی اور نکلتے ہوئے قد کی، بڑے خوش نما اونچے چوکور ماتھے اور بھورے بالوں والی دبلی پتلی کمزور سی لڑکی تھی۔ چنانچہ اس کی تقریر کے آغاز میں دونوں نے خوب ہوٹنگ کی، مگر جب ایک دفعہ اس نے ان کو تاک کر بڑے اعتماد سے نظر جما کر اور آنکھیں سکیڑ کر بڑے کٹیلے انداز میں کوئی بات کہی تو وہ بھیگی بلی کی طرح سہم کر بیٹھ گئے اور پھر نہ بولے۔ اس کے بعد کئی بار ان کا آمنا سامنا ہوا۔ چنانچہ جب وہ پہلے پہل یونیورسٹی میں آئی تو وہ اس سے کچھ کچھ خائف رہے مگر اب وہ پہلے سال کی دبلی پتلی کمزور سی لڑکی نہ تھی اب وہ ایک بھرپور جوان عورت تھی اور اس کی سنہرے زرد رنگ کی جلد تھی اور بڑا چوڑا

اور اونچا ماتھا تھا اور جہاں سے اس کے ہلکے رنگ کے، جڑوں سے ابھر کر نکلے ہوئے بال شروع ہوتے تھے۔ بڑی سیدھی اور ہموار لائن تھی اور وہ اپنے گھنے بالوں کو لاپروائی سے ایک دم پیچھے کی طرف کنگھی کر کے ڈھیلا ڈھالا جوڑا بناتی تھی اور اسی طرح آنکھیں ہلکی سی سکیڑ کر بڑی سنجیدگی سے بات کرتی تھی اور کسی کو لفٹ نہ دیتی تھی۔ ان باتوں کو اور دوسری ساری حوصلہ شکن باتوں کو اور اس کی چال کی گریس کو اور اس کی شخصیت کی دل کشی کو ان دونوں نے اپنی اپنی جگہ پر، الگ الگ، دیکھا اور محسوس کیا اور بڑھنے لگے ——— دور ہونے لگے۔

پہلے اس کا ذکر آپس میں بند ہوا، پھر طنزیہ جملوں پر نوبت آئی، پھر آہستہ آہستہ سب کچھ ختم ہو گیا اور وہ اپنے اپنے راستوں پر بڑھتے گئے۔ اس نے کہانیاں لکھیں اور تقریریں کیں اور ٹرافیاں جیتیں، مس جمال افروز انصاری کو ڈی بیٹنگ ٹیم کا نائب لیڈر بنوایا، اس کی تصویر میگزین کے پورے صفحے پر چھاپی اور بڑا شاندار نوٹ لکھا۔ ریاض نے ہاکی ٹیم کی کپتانی سنبھالی اور انٹرورسٹی چیمپئن شپ جیتی پھر اس نے اپنے باپ کے پیسے کا پورا پورا استعمال کیا۔ اس نے بڑھیا سوٹ سلوائے اور ایک چھوٹی سی کار خریدی جس پر بیٹھ کر روزانہ یونیورسٹی آنے لگا۔ دونوں مقبولیت اور کامیابی کی آخری سیڑھی پر کھڑے تھے اور سانس روکے اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔ وہ جب ڈائس پر چڑھ کر "مسٹر پریذیڈنٹ، آنریبل جج، لیڈیز اینڈ جنٹلمین" کہہ چکتا تو سیدھا اگلی قطار میں بیٹھی ہوئی (اپنے روشن ماتھے کو اوپر اٹھائے، آنکھیں ہلکی سی سکیڑ کر غور سے اسے دیکھتی ہوئی) اس کو ایک لمحے کے لئے بڑی شدت سے دیکھتا اور نظر اٹھا لیتا اور پھر الفاظ اس کی زبان سے ایسی روانی اور قوت سے نکلتے کہ اس کا بدن اڑنے لگتا۔ پھر جب میگزین سہ ماہی کی سہ ماہی چھپ کر آتا تو وہ دن بھر کنکھیوں سے اسے اس کی ورق گردانی کرتے ہوئے دیکھتا اور اس انتظار میں رہتا کہ کب وہ اس سے اس کا

ذکر کرتی ہے۔ اور ریاض تھا، جو ہاکی کے میدان میں ایک "پاس" بھی کام کا دیتا تو مڑ کر ایک نظر ہزاروں کے مجمعے میں اس سبز لباس پر ڈال لیتا، مقابلے کی کوئی دوڑ جیتتا تو ہانپتا ہوا ضرور اسکے سامنے سے گزرتا، اور دن دن بھر کسی نہ کسی طرح اس کی نظر کے سامنے رہتا۔ جب ڈی بیٹنگ ٹیم کراچی گئی تو وہ بھی ان سے الگ چھٹی لے کر وہاں پہنچا اور شوکت کی تقریر کے دوران اس نے کراچی یونیورسٹی کے لڑکوں کے ساتھ مل کر خوب ہوٹنگ کی۔ جب ان کی ٹیم نے بہرحال مباحثے کی ٹرافی جیت لی اور وہ لڑکے لڑکیوں میں گھرے ہوئے باہر نکلے تو وہ بے انتہا مسرور جمال کے سامنے آ کھڑا ہوا اور بولا: "مبارک ہو جال۔" اور جمال نے اس کا شکریہ ادا کیا اور دونوں دیر تک کھڑے باتیں کرتے رہے۔ اس وقت وہ وہاں سے چلا آیا تھا اور دور برآمدے میں کھڑا انہیں دیکھتا رہا تھا۔ آخر جب وہ ریاض سے رخصت لے کر اس کے پاس پہنچی تھی تو اس نے پہلی بار بے اختیار ہو کر کہا تھا: "کیا باتیں ہو رہی تھیں؟" اور وہ ہنس کر بولی تھی۔
"مبارک باد وصول کر رہی تھی۔" اور سن کر اس کا دل بیٹھ گیا تھا اور حسد کا جلتا ہوا جذبہ اس کے دماغ کو جا چڑھا تھا اور وہ خفگی سے بولا تھا: "مبارک باد میں اتنی دیر لگ گئی!" اور پہلی بار اس نے رک کر، آنکھیں سکیڑ کر غصے سے کہا تھا: "یہ مجھ پہ کیسا حق جتا رہے ہو شوکت!" اور اس کے بعد وہ ایک ہفتے تک اس کے قریب نہ پھٹکا تھا۔ (یہ چھوٹی چھوٹی باتیں تھیں جو بڑے انجانے طور سے دل کو دل شکنی کے قریب لا رہی تھیں۔)

پھر فیصلہ کن وقت وہ آیا جب اس نے اور ریاض نے یونیورسٹی سٹوڈنٹس یونین کی صدارت کے لئے انتخاب لڑنے کا اعلان کیا۔ ان کی بول چال تقریباً بند ہو چکی تھی، مگر اعلان سے چند روز پہلے وہ ٹک شاپ سے نکل رہا تھا کہ ریاض اسے دروازے پر کھڑا ہوا مل گیا۔ اس وقت وہ اکیلا تھا اور وہاں

کھڑا شاید اسی کا انتظار کر رہا تھا۔ اسے دیکھ کر آگے بڑھا اور پرانے پیارے انداز میں اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولا:

"میں نے سنا ہے تم کھڑے ہو رہے ہو شوکی۔"

"ہاں۔"

"مت کھڑے ہو۔"

"کیوں؟"

"ہار جاؤ گے۔"

وہ بڑے اعتماد سے اور بڑے طنز سے ہنستا تھا: "اپنی خیر مناؤ میاں۔" اس نے کہا تھا۔

"تمہارا کوئی چانس ہی نہیں ہے شوکی۔"

"یہ تو پتا چل جائے گا بھئی۔" اس نے بجد اکتا کر کہا تھا۔

دونوں ایک طویل لمحے تک ایک دوسرے کو دیکھتے رہے تھے۔ پھر ریاض نے اس کے کندھے پر سے ہاتھ اٹھا لیا تھا۔

"اچھا، تمہاری مرضی۔" وہ جاتے جاتے بولا تھا: "مگر ایک بات یاد رکھو" اس نے کہا تھا: "جمال تمہارا ساتھ نہیں دے گی۔"

اس کا دل بیٹھ گیا تھا مگر وہ بڑے طنز سے کھوکھلی سی ہنسی ہنس کر بولا تھا: "دیکھا جائے گا۔"

پھر گروہ بندیاں ہوئیں اور سکیمیں بنیں۔ پوسٹر چھپے اور پارٹیاں ہوئیں اور ڈھیروں کیچڑ اچھالی گئی۔ اسکینڈل اڑے اور نعرے لگائے گئے اور جوان اور لاپروا دلوں نے خوب خوب ایک دوسرے پر وار کیے مگر جمال کے پاس ان دونوں میں سے کوئی بھی نہ گیا۔ صرف دل تھامے دونوں انتظار کرتے رہے، انتظار کرتے رہے۔ آخر اس نے خود ہی ایک روز اسے برآمدے میں روک لیا۔

"آج کل بڑا ہنگامہ ہو رہا ہے جناب۔" وہ ہنس کر بولی: "بڑے مصروف ہیں آپ!"

"نہیں تو۔"

"کون کون کھڑا ہو رہا ہے؟" اس نے انجانے پن سے پوچھا۔

"ہاہا۔" وہ گھبرا کر ہنس پڑا۔

پھر وہ سنجیدہ ہو گئی: "مجھ سے تو تم نے کہا ہی نہیں شوکت۔"

"کیا؟"

"ووٹ کا۔"

"تمہارا ووٹ۔" جواب دیتے دیتے وہ سرخ ہو گیا تھا: "تو میرا اپنا ہی ہے جان۔"

"اتنا اعتماد ہے تمہیں؟" وہ بولی تھی۔

"ہاں۔" اسنے کہا تھا، اور جواب میں وہ ہنس دی تھی، جیسے کہہ رہی ہو: "تو پھر ٹھیک ہے شوکی۔" اور ریاض جیسے اسی روز ہار گیا تھا۔

جس روز وہ منتخب ہوا اس کے ساتھیوں نے اسے کندھوں پر چڑھا کر ریاض کے کیمپ کے سامنے بھنگڑہ ڈالا اور سٹاف کی نظروں کے سامنے پتلونیں نکال دیں اور اگر چند پروفیسر بیچ بچاؤ نہ کرتے تو شاید بلوہ ہو جاتا۔ اسی روز ریاض یونیورسٹی سے غائب ہو گیا تھا۔

پھر وہ کبھی وہاں لوٹ کر نہ آیا۔ چند روز کے بعد اسے صرف ایک خط ملا تھا جس میں ایک جملہ لکھا تھا: "شوکت اور جمال کو مبارک باد۔" جسے پڑھ کر وہ خوب ہنسا تھا اور جمال اداس ہو گئی تھی۔ پھر سنا گیا کہ وہ اپنے اخبار کا لندن کارسپانڈنٹ ہو گیا ہے۔ اسی سال شوکت نے فرسٹ کلاس فرسٹ رہ کر امتحان پاس کیا اور اگلے سال چانسلر کے ہاتھ سے گولڈ میڈل وصول کیا اور پھر ان کی

شادی ہو گئی۔ چند ہی برس کے اندر وہ اپنے شہر کا سب سے مشہور اور بھاری معاوضہ پانے والا فری لانس جرنلسٹ بن گیا۔ پھر وہ نئی دنیاؤں اور نئی کامرانیوں کی تلاش میں اس شہر کو ہجرت کر آئے۔ جہاں دو منزلہ بسیں چند ایک تھیں اور صرف خاص خاص راستوں پر چلتی تھیں۔ شادی کے چند سال بعد تک وہ بہت خوش رہے تھے۔ بہت ہی خوش رہے تھے۔ فتح و کامرانی کے ان آفاق کا نام اب ماضی تھا جس کے سنہرے زرد رنگ کو یاد کرتے کرتے اب وہ سو چلا تھا۔

جب وہ سو کر اٹھا تو سورج سر پر آن پہنچا تھا اور جمال ابھی نہ لوٹی تھی۔ اس نے اٹھ کر کپڑے پہنے' جمال کے اٹیچی کیس سے ڈھونڈ ڈھانڈ کر کچھ پیسے نکالے اور انہیں جیب میں ڈال کر باہر نکل آیا۔ فٹ پاتھ پر اترتے ہی دوپہر کی تیز دھوپ اس کی آنکھوں کو لگی اور اس نے ہاتھ سے ان پر سایہ کر لیا۔ آنکھوں پر ہاتھ کا سایہ کیے وہ دور تک چلتا گیا' پھر ایک چوراہے پر رک کر اس نے ہاتھ اٹھایا اور کئی بار آنکھوں کو جھپک کر ادھر ادھر دیکھا اور ایک طرف کو چل پڑا تھوڑی دیر کے بعد وہ ساحل سمندر پر نکل آیا۔ ساحل پر کئی لوگ گھوم رہے تھے۔ اس نے کچھ لوگوں کو غور سے اور کچھ کو سرسری طور سے دیکھا اور ادھر ادھر پھرتا رہا۔ پھر وہ ریستوران میں جا کر سمندر کے رخ کھلنے والی کھڑکی کے پاس اپنی مخصوص جگہ پر بیٹھ گیا اور باہر دیکھنے لگا۔ باہر ریتلے ساحل پر اور سطح سمندر پر دھوپ پھیلی ہوئی تھی' مگر فضا کا وہ گہرا گدلا نیلا سا رنگ' جو اب ہر طرف چھایا رہتا تھا' بدستور موجود تھا۔ اسی ہی رنگ کی بھاری نمدار ہوا' جس میں سمندر کی مخصوص بو رچی ہوئی تھی' ڈائننگ ہال کے آر پار چل رہی تھی۔ وہ میز پر کہنیاں رکھے دیر تک بیٹھا ٹکٹکی باندھے باہر کے منظر کو دیکھتا اور چھاتی کے بوجھ کو ہلکا کرنے کے لئے لمبے لمبے سانس لیتا رہا۔ اندر ہال میں اب لوگ آ آ کر بیٹھنا شروع ہو گئے تھے اور کھانا لایا جا رہا تھا۔ کچھ لوگ بیئر پی رہے تھے۔

ہال کے دروازے پر سلیم' جو اس کا شاعر دوست تھا' اپنی بیوی جمیلہ اور ایک دوست کریم بھائی کے ہمراہ نمودار ہوا۔ (افواہ تھی کہ کریم بھائی آج کل اسے سپورٹ کر رہا تھا) وہ تینوں ادھر ادھر نظر دوڑاتے ہوئے آ کر اس کی میز کے گرد بیٹھ گئے۔

"ہلو شوکی۔" سلیم نے کہا۔

"ہلو" وہ چونک پڑا: "ہلو ہلو۔"

"کہاں چھپے رہے اتنے روز تک؟"

"ملک عدن کی سیر کو گیا تھا۔" وہ بولا "صحت بنا رہا تھا۔"

"ایں؟ اچھا ان سے ملو' کریم بھائی کراچی والا۔" سلیم نے تعارف کرایا: "کریم بھائی یہ میرا دوست ہے شوکت محمود۔ ملک کا سب سے بڑا اخبار نویس۔"

"پیپر والا؟" کریم بھائی نے پوچھا: "جرنلسٹ؟"

"ہاں' پیپر والا جرنلسٹ۔" ادھیڑ عمر' غیر دلچسپ حلیئے والا بوہرہ منہ کھول کر ہنسا: "ویری گریٹ جرنلسٹ۔" وہ اس وقت خاصا مدہوش تھا۔ پہلے دو چار بار اس نے قریب سے گزرتے ہوئے بیرے کو متوجہ کرنے کی کوشش کی' پھر ایک دم جھنجھلا کر زور زور سے میز پر ہاتھ مارنے لگا۔

"سالا کیا گڑبڑ ہے ادھر؟" وہ چیخا: "بیرا——"

بیرے کو اس نے تین بیئر اور ایک لائم جوس کا آرڈر دیا۔

"میں کھانا کھاؤں گا۔" شوکت نے کہا۔

"کھانا بھی کھائے گا۔" وہ بولا: "سالا وہ بھی کھائے گا بعد میں۔"

"ویری گریٹ سالا۔" شوکت نے اس کے کندھے پر دھپڑ جمایا: "ہاں ہا۔"

بیرا جب آرڈر لے کر آیا تو کریم بھائی نے بیئر کا مگ اٹھا کر منہ سے لگا لیا

اور غٹ غٹ پینے لگا۔ شوکت اور سلیم اپنے اپنے مگوں کو تھامے بیٹھے رہے۔ جمیلہ لائم جوس کے چھوٹے چھوٹے گھونٹوں کے درمیان گہری نظروں سے شوکت کو دیکھتی رہی۔

"ایک عرصے سے تمہارا نام نہیں دیکھا۔" سلیم نے کہا۔

ایک عرصے سے میں نے بھی اپنا نام نہیں دیکھا۔" وہ بولا : "حیرت ہے۔"

"لکھتے کیوں نہیں؟"

"کیا لکھوں؟" اس نے معصومیت سے سوال کیا۔

"سالا سوب گھپلا ہے ادھر۔" کریم بھائی پھر زور زور سے میز پر مکے مارنے لگا: "بیرا ——"

بیرا کریم بھائی کا مگ دوبارہ بھر کر لے آیا۔ سلیم آہستہ سے ("ہا" کر کے' جیسے کتا کبھی کبھی بے خیالی میں مختصر سی آواز نکالتا ہے) ہنسا۔

"میں نے ایک نظم لکھی ہے۔" اس نے کہا۔

"نظم لکھنا بھی بڑا مفید ہوتا ہے۔ یہ بھی اتنا ہی ضروری ہے جتنا صحت بنانا۔ مبارک ہو۔"

"سالا سوب مرگیا ادھر۔" کریم بھائی پھر میز بجانے اور شور مچانے لگا: "سوب مرگیا' سوب مرگیا سالا۔" یہاں تک کہ بیرا بھاگتا ہوا آیا اور بھرا ہوا مگ اس کے سامنے رکھ گیا۔

"یہ دارالخلافے کا کیا چکر ہے؟" سلیم نے پوچھا۔

دارالخلافے کو پہیے لگائے جا رہے ہیں۔" وہ بولا۔

"ایں؟"

"پہیے لگ جانے کے بعد پٹرول ڈال کر ہانکا جائے گا اور ملک عدن کو لے

جایا جائے گا۔"

"تم اب لکھتے کیوں نہیں شوکی؟"

میں بھی یہی سوچ رہا ہوں۔" وہ بولا: "حیرت کی بات ہے۔"

"تمہاری وہ عجیب و غریب دلچسپ سکینڈلس تحریر دیکھنے کو آنکھیں ترس گئی ہیں۔"

"سلیم۔" وہ پہلی بار سنجیدگی سے دلچسپی لے کر بولا : "مجھے اپنی نظم سناؤ۔"

سلیم ہنسا: "بس ایسی ہی ہے۔"

"نہیں سناؤ۔"

سلیم نے کھانس کر گلا صاف کیا اور ایک منٹ تک فضا میں دیکھتا رہا: "تو فلک فلک کا والی ——" پھر اس نے نرم آواز میں کہنا شروع کیا: "تو فلک فلک کا والی' میں زمین زمین کا مولا ——" دیر تک وہ اپنی آواز میں کھویا ہوا نظم سناتا رہا۔

نظم سنتے ہوئے اس کے چہرے پر رنگ جھلک آیا اور وہ باہر کے منظر کو تقریباً بھول گیا۔ جب نظم ختم ہوئی اور کریم بھائی نے پھر شور مچانا شروع کیا تو اس کا چہرہ پھر بے رنگ ہو گیا اور سیاہ مائع آنکھیں ٹھہر گئیں اور وہ باہر دیکھنے لگا۔ کانچ کی سی ٹھہری ہوئی نظروں سے وہ کھڑکی سے باہر نیلے ریتلے ساحل پر بھڑکیلے پھول دار لباسوں اور چمکیلے سفید بدنوں اور سیاہ چشموں اور چوڑے چوڑے ربنوں والے ہیٹوں کو دیکھتا رہا۔ سب خاموش بیٹھے بیئر پیتے رہے۔ پھر سلیم اپنی جگہ پر کسمایا۔

"شوکت:" وہ آگے جھک کر بے چینی سے بولا: "کیا کر رہے ہو آج کل؟"

"کچھ نہیں۔"

"لکھتے کیوں نہیں؟"

"کیا لکھوں؟" اس نے کہا: "اب کیا لکھوں؟"

چاروں خاموش بیٹھے رہے۔ کریم بھائی اب آدھی بیئر پیتا اور آدھی کپڑوں پر گراتا جا رہا تھا۔ جمیلہ نے اپنا گلاس میز کے وسط میں دھکیل دیا۔

"بڑا خوش گوار دن ہے۔" سلیم نے اداسی سے دوہرایا۔

پھر انہوں نے چونک کر شوکت کو دیکھا جس کے چہرے پر رنگ جھلک آیا تھا۔ وہ چمکتی ہوئی مسرور آنکھوں سے دونوں کو دیکھ رہا تھا۔

"تم نے "دن" پڑھا ہے؟" اس نے کہا۔

"ایں؟"

"بڑی نازک چیز ہے۔"

"کیا؟"

"دن۔"

"دن کیا؟"

"وہ ناولٹ!" اس نے مختصراً کہا۔

سلیم اور جمیلہ انجان نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔ اس کی آنکھوں میں پھر ٹھہری ہوئی سختی ابھر آئی اور وہ باہر دیکھنے لگا جہاں فضا کا گدلا نیلا رنگ تھا۔

ہال کے وسط میں ایک بیرے کے ہاتھ سے پانی کا بھرا ہوا شیشے کا جگ پھسل کر گرا اور ٹوٹ کر دور دور بکھر گیا۔ دفعتاً کریم بھائی اپنے مگ پر منہ رکھ کر بچوں کی طرح رونے لگا۔ سلیم بڑے اطمینان سے میز پر کہنیاں رکھے چند لمحے تک اسے مگ میں منہ ڈال کر روتے اور بڑبڑاتے ہوئے ("سالا ایک دم گھپلا کر

دیا ——— سالا ڈوپ کر دیا میرے پرنس کو ——— سالا میرے پرنس کو ہو ہو ہو ———") دیکھتا رہا، پھر اسے بازو سے پکڑ کر اٹھاتے ہوئے بولا: "چلو۔"

کریم بھائی مگ کو منہ سے چپکائے اٹھ کھڑا ہوا اور اس کے ساتھ ساتھ چل پڑا۔

"چلو۔" سلیم نے جمیلہ سے کہا۔ وہ خاموش بیٹھی میز پر انگلیاں بجاتی رہی۔

"یہیں بیٹھو گی؟"

"ہاں۔"

"اچھا شوکی ——— پھر ملاقات ہو گی۔" سلیم آہستہ سے ہنسا: "میری بیوی کا خیال رکھنا۔ اسے تم سے عشق ہے۔" وہ روتے ہوئے کریم بھائی کو بازو سے پکڑ کر چلاتا ہوا کاؤنٹر کی طرف لے چلا۔

شوکت نے ٹھہری ہوئی نظروں سے جمیلہ کو دیکھا۔

"پرنس کو آج گولی مار دی گئی۔" وہ بولی۔

"پرنس؟"

"کریم بھائی کا بہترین گھوڑا تھا۔" وہ میز پر جھک کر بیٹھ گئی: "آج ریس میں لیڈ کر رہا تھا کہ ٹھوکر کھا کر گر پڑا۔ اس کی دونوں اگلی ٹانگیں ٹوٹ گئیں۔ انہوں نے اسی وقت اس کے دماغ میں گولی مار دی۔ بڑا خوبصورت جانور تھا۔

وہ کرسی سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا اور اس کے چہرے پر ہلکا سا رنگ جھلک آیا۔ ایک بڑا واضح اور روشن منظر وہ تھا جب وہ ہائی سکول میں تھا اور صبح صبح سائیکل پر سوار سکول کو جا رہا تھا کہ سامنے سے ایک خوبرو جوان ایک منہ زور گھوڑے کی ننگی پیٹھ پر بیٹھا، چاروں پاؤں پر اسے بھگاتا ہوا نمودار ہوا۔ سڑک کے چوک میں پہنچ کر گھوڑا دفعتاً ہنہنایا اور پچھلی ٹانگوں پر کھڑا ہو گیا اور اس

کے نعل ٹھکے سم ہوا میں کپکپانے لگے۔ اس نے سڑک کے کنارے اپنی سائیکل روک لی اور ایک پاؤں زمین پر ٹکا کر دیکھنے لگا۔ سوار کے چہرے پر ہراس کا نام تک نہ تھا۔ وہ دانت پیس کر وحشیانہ قوت کی خوشی کے زیر اثر جیسے ہنس رہا تھا اور رکابوں پر اٹھا' باگوں سے لٹکا ہوا جیسے گھوڑے سے کشتی لڑ رہا تھا۔ کچھ دیر کے بعد اس نے گھوڑے کو قابو میں کر لیا۔ گھوڑے نے اگلے پاؤں زمین پر لا رکھے اور زور سے ہنہنایا اور صبح کی زرد دھوپ میں گرد کے لاکھوں ذرات اڑاتا ہوا ایک طرف کو بھاگ گیا۔ گھوڑے کے کوچ کے اس منظر میں کوئی خاص بات نہ تھی' مگر اس وقت وہاں بیٹھے ہوئے (کھڑکی سے باہر گدلے نیلے رنگ کو چاروں طرف سے اڈتے ہوئے دیکھ کر) اس کو اس سفید براق گھوڑے کی چوڑی' پلی ہوئی پیٹھ کی اور اس پر بڑے اعتماد اور توازن سے جم کر بیٹھے ہوئے اور اس کی اڑان کے ساتھ اڑتے ہوئے سوار کی بڑی واضح اور روشن یاد آئی کہ دل اس زمانے میں بڑا شہ زور اور بیخ پا اسپ تازی تھا۔

اب سلیم بڑی کوشش کے بعد بیئر کے مگ کو کریم بھائی کے منہ سے جدا کرنے میں کامیاب ہو چکا تھا۔ پھر وہ بل ادا کر کے اسے بازو سے پکڑے پکڑے باہر نکل گیا۔

"کیا پیو گی فاختہ؟" شوکت نے پوچھا۔

"لائم جوس۔"

شوکت نے بیرے کو اپنے لیے کھانا اور جمیلہ کے لیے ایک اور لائم جوس لانے کا آرڈر دیا۔

جب وہ کھانا کھا رہا تھا تو جمیلہ نے اپنے گلاس سے ایک چھوٹا سا گھونٹ بھرا اور آگے جھک کر بیٹھ گئی۔

"شوکی" اس نے کہا "تم ریاض سے ملے تھے؟"

"نہیں۔"

"کیوں؟"

وہ خاموش اور تندی سے کھاتا رہا۔

"تم نے وعدہ کیا تھا شوکی۔"

"کیا؟"

"کہ ایک بار اس سے ضرور ملو گے۔"

اس نے ناچتی ہوئی نظروں سے اسے دیکھا اور بولا: "کب کیا تھا؟"

"کیا کیا تھا!" وہ ہاتھ جھٹک کر مایوسی اور بے یقینی سے بولی: "ایک ہفتہ پہلے کی بات کو تم بھول بھی گئے ہو؟"

"نہیں تو۔"

"اوہ شوکی۔" وہ مایوسی سے سر ہلا کر بولی: "اب تم جھوٹ بھی بولنے لگے ہو۔"

"جھوٹ بولنا کوئی مشکل کام نہیں!" وہ دوبارہ کھانے لگا۔

"شوکی ——" جمیلہ اس کے بازو پر ہاتھ رکھ کر بولی: "چلو مان لیا کہ تم نے —— میری بات سنو شوکت۔"

"سن رہا ہوں فاختہ۔"

"ایک بار تو کم از کم ——" اس نے ڈرتے ڈرتے اس کے کندھے کو چھوا: "کم از کم بات تو کر کے دیکھو مجھے یقین ہے کہ تم اسے راضی کر سکتے ہو۔ صرف ایک بار شوکی۔" وہ بولی: "میری خاطر۔"

"تمہاری خاطر میں کیا کیا کرتا پھروں بھئی؟"

"میری خاطر!" وہ پھٹ پڑی: "میری خاطر تم نے کیا کیا ہے؟ ہاں کیا کیا ہے؟ کبھی بھی۔"

وہ ہاتھ روک کر اسے دیکھنے لگا۔ یہ ایک اور سنہرے زرد رنگ کا چہرہ تھا جو جی کو اچھا لگتا تھا۔ وہ کئی سال تک کالج اور یونیورسٹی میں ساتھ ساتھ رہے تھے اور اس لڑکی نے ٹوٹ کر اس سے محبت کی تھی مگر کبھی منہ سے نہ بولی تھی۔ (وہ ان لڑکیوں میں سے تھی جو چپکے ہی چپکے محبت کر کے اپنی تکمیل کر لیتی ہیں اور پھر عمر بھر اسی قوت کے سہارے خوش رہتی ہیں) وہ سب جانتا تھا مگر کبھی اس کی طرف راغب نہ ہوا تھا کہ اس لڑکی میں اس کے لیے کوئی کشش نہ تھی۔ وہ اس کے لئے کچھ بھی نہ کر سکا تھا۔ اب اس کا اجلے زرد رنگ کا چہرہ جی کو بڑا اچھا لگتا تھا بہر حال۔ وہ کھانا ختم کر کے اٹھ کھڑا ہوا: "اچھا" اس نے تھکے ہوئے لہجے میں کہا: "چلو۔"

وہ باہر نکل آئے۔

"شوکی" فٹ پاتھ پر اس کے ساتھ چلنے کی کوشش کرتے ہوئے وہ بولی: "بھئی آہستہ چلو۔"

تھوڑی دیر کے بعد وہ "روزنامہ ——" کی سات منزلہ مہیب عمارت میں داخل ہوئے۔ وسیع ہال میں ہر طرف اخباروں کے ترتیب وار ڈھیر لگے ہوئے تھے اور پکیر لڑکے پھرتی سے ہاتھ چلاتے ہوئے انہیں چھوٹے چھوٹے بنڈلوں میں باندھ رہے تھے۔ تہہ خانے سے پریس کی مشینوں کے چلنے کی گڑگڑاہٹ سنائی دے رہی تھی۔ سب جگہ پر نیوز پرنٹ کی مخصوص بو رکی ہوئی تھی۔ وہ لفٹ پر سوار ہو کر چوتھی منزل پر جا اترے۔ برآمدوں اور گیلریوں میں چشموں والے مرد بریف کیس اٹھائے ادھر ادھر آ جا رہے تھے، کھڑے باتیں کر رہے تھے اور پسینہ پونچھ رہے تھے۔

"ہلو سر۔" ایک رپورٹر اپنے ساتھی سے باتیں کرنا چھوڑ کر اس کی طرف بڑھا۔

"ہلو۔" وہ ناآشنا نظروں سے اسے دیکھتا ہوا آگے نکل گیا۔

"کون ہے؟" رپورٹر کے ساتھی نے پوچھا۔

"تم نہیں جانتے؟" وہ حیران ہو کر بولا: "شوکت محمود۔"

"ارے!" دوسرا رپورٹر چونک پڑا۔ "تو یہ شوکت محمود ہے۔"

"ہاں، جدید رپورٹنگ کا بانی۔" پہلا طنز سے ہنسا: "غرور سے آسمان پر چڑھتا جا رہا ہے۔"

"مگر انور۔" دوسرے نے کہا: "تم نے اس کی بنگال کی رپورٹیں پڑھی ہیں؟"

"ارے ہاں بھئی۔" انور نے اکتا کر کہا: "بہت کچھ پڑھا ہے۔"

"بڑے عرصے سے میری اس سے ملنے کی خواہش ہے۔" دوسرے نے کہا: "اب بہت کم لکھتا ہے مگر۔"

"اب بڑا آدمی بن گیا ہے۔"

"یہ اس کی بیوی ہے؟"

"ارے نہیں بھئی، اس کی بیوی تو" انور نے انگوٹھا اور درمیانی انگلی ملا کر، ایک آنکھ بھینچ کر ہلکی سی سیٹی بجائی: "اے ون ہے، اے ون!"

وہ جمیلہ کے ساتھ چلتا ہوا اس دروازے کے سامنے جا رکا جس پر "مینجنگ ڈائریکٹر" کا بورڈ لگا تھا۔

"چلو۔" اس نے کہا۔

"نہیں تم جاؤ، میں اس کی سیکرٹری کے پاس بیٹھی ہوں۔ اور شوکی" وہ ملتجیانہ لہجے میں بولی: "پورے دل سے کوشش کرنا، میری دعائیں تمہارے ساتھ ہیں۔"

"وی فار وکٹری۔" اس نے کہا اور دروازہ کھول کر ریاض کے ایئر کنڈیشنڈ

دفتر میں داخل ہوا۔ ریاض میز پر جھکا' سیاہ فریم کا پڑھنے والا چشمہ لگائے سفید کاغذ پر کچھ لکھ رہا تھا۔ وہ کرسی کھینچ کر اس کے سامنے بیٹھ گیا۔

"ہلو۔" ریاض نے سر اٹھا کر اسے دیکھا اور چشمہ اتار کر میز کے شیشے پر رکھ دیا۔ پھر اس نے کرسی سے ٹیک لگا کر لمبا سانس چھوڑا اور اپنائیت سے بولا:

"ہلو شوکی۔"

"ہلو ریاض۔" اس کی بے مقصد نظروں نے آفس کی دیواروں کا جائزہ لیا جہاں بڑی بڑی فریم شدہ تصویریں لٹک رہی تھیں۔

"بہت دنوں کے بعد نظر آئے ہو۔" ریاض نے کہا۔

"تم بھی تو دکھائی نہیں دیئے۔"

"ہاہا۔" ریاض ہنسا: "میں تو یہیں پر تھا۔"

"ہاہا' گو میں بھی یہیں تھا۔"

ریاض نے بڑی فراغت سے پائپ میں تمباکو بھرا اور اسے سلگا کر ہلکے ہلکے کش لینے لگا۔

"کیسے رہے؟" پھر اس نے پوچھا۔

"اے ون۔" اس نے کہا۔

"جال آئی تھی۔"

"کب؟"

"آج سویرے۔" ریاض نے کہا: "اسے سروس مل گئی ہے۔"

کہاں؟"

"وہاں کالج میں۔"

"کچھ دبلے نظر آ رہے ہو ریاض۔"

"میں؟" ریاض ہلکی سی پریشانی سے ہنسا: "نہیں تو۔ ذرا کام کا بڑا رش رہا

پچھلے دنوں۔"

"بہت محنت کرنے لگے ہو۔"

"ہاہ۔"

"ریاض ———" وہ کرسی پر کسمسایا اور میز پر کہنیاں رکھ کر بیٹھ گیا۔

"یکم سے شروع کر رہی ہے۔" ریاض نے کہا: "گو ابھی عارضی طور پر ———"

"ریاض" اس نے کھنکار کر گلا صاف کیا' "میں کام کے لئے آیا تھا۔"

وہیں بیٹھے بیٹھے' آنکھ جھپکے بغیر ریاض کی نظریں جیسے بہت دور اندر کو سمٹ گئیں۔ وہ دیوار پر لٹکی ہوئی ایک پینٹنگ کو گھورنے لگا۔

"یہ پینٹنگ میں نے صادقین سے آج ہی خریدی ہے۔" اس نے کہا: "کیسی ہے؟"

"اے ون۔"

ریاض اٹھ کھڑا ہوا: "اب میں اس سے میورلز بنوا رہا ہوں یہاں۔" اس نے دائیں بازو کی دیوار کی طرف اشارہ کیا: "کیا خیال ہے؟"

"ریاض" وہ جلدی سے کھڑا ہوتا ہوا بولا: "میں کام کی تلاش میں آیا ہوں۔"

"کام؟" ریاض نے جیسے پہلی بار سنا اور وہ چونک کر ہنسا۔ "بیٹھ جاؤ شوکی۔ کام کی تمہیں کمی ہے؟"

وہ چپکے سے بیٹھ گیا۔

"تم تو بڑے نامور آدمی ہو۔" ریاض پھر بولا: "تمہارے قلم کی تو بڑی قیمت ہے ——— یا کم از کم ہوا کرتی تھی۔"

"قیمت مائی فٹ۔" اس نے کہا: "صرف تمہارے اخبار میں تھوڑی سی

جگہ مانگنے آیا ہوں۔"

"تم تو ہمارے سٹار کارسپانڈنٹ تھے شوکی۔" ریاض اداسی سے بولا: "تم خود ہی ہمیں چھوڑ گئے تھے۔"

"سٹار کاسپانڈنٹ مائی فٹ۔"

"پھر تم نے کہا کہ ملک کا کوئی بھی اخبار تم سے لکھوانا اپنے لئے فخر سمجھے گا، اور تم ہمیں چھوڑ کر چلے گئے۔"

"اچھا اچھا۔" وہ بیک وقت ہنستا اور غصے سے لرزتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا: "ٹھیک ہے۔ میں نے اپنے قلم پر ناز کیا اور منہ کی کھائی۔ ٹھیک ہے۔ مگر اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ میرا ناز غلط تھا۔ اس سے تمہی لوگوں کی ـــــ جرنلزم کے خداؤں کی جہالت کا علم ہوتا ہے۔"

"بیٹھ جاؤ شوکی۔" ریاض نے نرمی سے کہا: "کون کہتا ہے تمہارا ناز غلط تھا۔ آج بھی اگر تم چاہو تو فرسٹ ریٹ رپورٹنگ کر سکتے ہو۔ صرف اگر تم اپنے احمقانہ خیالات کو ـــــ"

"فرسٹ ریٹ؟" وہ چیخا: "یہ فرسٹ ریٹ رپورٹنگ ہے؟ یہ جو تم کر رہے ہو یا کروا رہے ہو یا جو میں کرتا رہا ہوں؟ یہ تھرڈ ریٹ سنسنی خیزی؟ یہ سیکنڈ ریٹ فکشن؟ فرسٹ ریٹ رپورٹنگ تم نے دیکھی ہی نہیں ریاض۔"

"میں دنیا بھر کی اخباریں پڑھتا ہوں شوکت۔ اگر نہ بھی پڑھوں تو کوئی فرق نہیں پڑتا۔ جرنلزم ایک بزنس ہے۔"

"ٹھیک ہے۔ میں اس بزنس کو آرٹ بنانا چاہتا ہوں۔ میں جرنلزم کو اوپر اٹھانا چاہتا ہوں۔ اس سطح پر لانا چاہتا ہوں جہاں لکھنے والے میں اور پڑھنے والے میں براہ راست تعلق قائم ہوتا ہے، جہاں دونوں فریق عمومیت کی زہریلی فضا سے نکل کر آزادی اور ذہانت سے ایک دوسرے کے ساتھ گفتگو کر سکیں، جہاں

وہ ایک تہذیب یافتہ قوم بنیں۔ یہ احمقانہ خیالات ہیں؟"

ریاض کے انٹرکام پر چھوٹا سا بلب روشن ہوا۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر سوئچ آن کیا تو اس کی سیکرٹری کی آواز آئی: "پروفیسر شریف تشریف لائے ہیں۔"

"پانچ منٹ۔" ریاض نے جلدی سے کہا اور سوئچ آف کر دیا۔ پھر اس نے جھک کر میز کی نچلی دراز سے کاغذوں کا ایک پلندہ، جس پر گرد کی ہلکی سی تہہ جمی تھی، نکالا اور میز پر رکھ دیا۔ جب وہ بولا تو اس کی آواز میں ہلکی سی اکتاہٹ تھی:

"آج سے ٹھیک ایک برس پہلے ہم اس مسئلے پر بحث کر چکے ہیں، تمہیں یاد ہو گا۔" اس نے کہا: "اب اسے دوہرانے سے کوئی فائدہ نہیں، تمہارے مضمون" اس نے پلندے کی طرف اشارہ کیا: "ایک سال سے میرے پاس پڑے ہیں اور میں انہیں چھاپنے کی جرات نہیں کر سکا۔ مجھے ادب سے زیادہ واقفیت نہیں۔ ہو سکتا ہے کہ یہ اچھا ادب ہو، مگر یہ اچھی جرنلزم نہیں، میں جانتا ہوں۔ تمہارے پاس ٹیلنٹ ہے شوکت، میں مانتا ہوں۔ مگر تمہیں بزنس کی کوئی سمجھ نہیں۔ میں تم پر کوئی الزام نہیں لگا رہا، صرف اپنی پوزیشن واضح کر رہا ہوں۔ پبلک جو کچھ مانگتی ہے ہم اسے وہی کچھ مہیا کرنے پر پابند ہیں۔ جرنلزم اسے ہی کہتے ہیں، دنیا بھر میں۔"

"ریاض" وہ ایک دم ٹھنڈا پڑ گیا: "مجھے ایک چانس دو۔ صرف ایک۔ مجھے یقین ہے کہ میں جرنلزم میں انقلاب لا سکتا ہوں۔ مجھے بزنس کی سمجھ نہیں، مگر میں پبلک کو سمجھتا ہوں۔ پبلک اتنی بری نہیں جتنی ہم نے بنا رکھی ہے۔ پبلک کی عادات کو ہم لوگ ہی بناتے اور بگاڑتے ہیں۔ آج نہیں تو چھ ماہ کے بعد، ایک سال کے بعد پھر میری وہی ریڈر شپ ہو گی جو پہلے کبھی تھی۔ میں اس بات کی گارنٹی دیتا ہوں۔"

"ایک بات بتاؤ شوکی۔" ریاض نے اسے غور سے دیکھتے ہوئے پوچھا:
"یہ دیوانگی آخر کس نے تمہارے دل میں ڈالی ہے؟"
"دیوانگی؟"
"یہ آرٹ وارٹ کا چکر۔"
"اس بات کو چھوڑو۔"
"یہ اچھا بھلا لکھتے لکھتے ایک دم تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ ڈھنگ سے کچھ لکھ کر ہی نہیں دیتے؟"

"تمہیں پتا ہے ریاض کہ ہماری جرنلزم کو اس وقت تھوڑے سے تخیل کی کس قدر ضرورت ہے؟ کہ آج کی عوامی زندگی کی رپورٹنگ میں اور سٹاک ایکسچینج رپورٹ میں کوئی فرق نہیں رہا؟ کہ ہم نے رائے عامہ کو تباہ کر کے رکھ دیا ہے؟"

ریاض خاموشی سے پائپ بھرتا رہا۔

"میں کوئی بھاری معاوضہ نہیں مانگتا۔ میں اپنے کیریئر کو بالکل نئے سرے سے شروع کرنے پر راضی ہوں۔ تم آہستہ آہستہ میری قیمت بڑھا سکتے ہو۔ بہت آہستہ آہستہ ریاض۔ مجھے ایک چانس دو۔"

"میں یہ رسک نہیں لے سکتا بھئی۔" وہ اچانک اکتا کر بولا: "ایسا مواد پبلک کو مہیا کر کے ہم بزنس میں نہیں ٹھہر سکتے۔ میں دو پرچے اور خرید رہا ہوں' کچھ اور بھی فیچر بڑھا رہا ہوں۔ تمہارے لیے ایسے ایسے دیوانے تجربے نہیں کر سکتا۔ آج مارکیٹ میں کمپٹیشن کتنا ہے۔ ایک بار پیپر بیٹھ جائے تو برسوں کوئی نہیں پوچھتا۔ تمہارے سامنے کئی مثالیں ہیں۔"

"تم پچھلی باتوں کو نہیں بھولے ریاض۔" وہ بھڑک اٹھا' پھر فوراً ہی کرسی پر آگے ہو کر بیٹھ گیا اور ملتجیانہ لہجے میں بولا: "مگر ریاض' کبھی ہم ——— ہم

کبھی دوست بھی تھے۔ یاد ہے؟ میں نے تین راتیں جاگ کر تمہارے لیے وہ نوٹ میگزین میں لکھا تھا۔ یاد ہے؟ میں کئی ایسے لوگوں کو جانتا ہوں جنہیں آج بھی وہ نوٹ حرف بہ حرف یاد ہے۔ مجھے آج بھی وہ دن اچھی طرح سے یاد ہیں' ابھی جیسے کل ہی کی بات ہے کہ تمہارا کپتانی کا چکر چلا تھا اور تم میرے پاس آئے تھے کہ شوکی پالیٹکس چل پڑی ہے' اور کچھ لوگ اشرف کو سپورٹ کر رہے ہیں۔ تو میں نے کہا تھا: "کوئی بات نہیں ریاض' ایسا ہے تو ہم بھی پالیٹکس چلائیں گے۔" اور پھر میں نے میگزین میں اور ٹیم میں اور اندر اور باہر——— یاد ہے؟ میں نے ———"

"شوکت میرا خیال ہے تم تھوڑے سے دیوانے ہوتے جا رہے ہو۔"

ریاض کا چہرہ دبے ہوئے غصے سے لال ہو گیا۔ "میری بات سنو۔ میں تمہیں کچھ ایڈوانس دے دیتا ہوں۔ کچھ عرصے کے لیے شہر سے باہر کسی خاموش مقام پر چلے جاؤ۔ اپنی صحت کا خیال کرو اور ٹھنڈے دل سے اپنے کام کے بارے میں سوچو۔" اس نے جیب سے سیاہ' نفیس چمڑے کا بھاری بٹوہ نکالا۔ پھر اس میں سے سو سو کے دس نوٹ گن کر نکالے اور انہیں میز کے شیشے پر رکھ کر اس کی طرف دھکیل دیا۔ پھر اس نے چونک کر اس کے سرخ ہوتے ہوئے چہرے اور کانپتے ہوئے ہونٹوں کو دیکھا اور جلدی سے بولا: "کچھ اور مت سمجھو ——— یہ ایڈوانس ———"

شوکت کے ہونٹوں سے ابلتی ہوئی گالی نکلی اور وہ ایک جھٹکے سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اسی تیزی سے ریاض نے انٹر کام کا سوئچ آن کیا اور بولا: "پروفیسر صاحب کو آنے دو۔"

"یس سر۔" اس کی سیکرٹری کی آواز آئی۔ پھر ریاض اپنے آپ پر قابو پاتے ہوئے بولا:

"میرے دوست مجھ سے بغیر اپوائنٹمنٹ کے بھی مل سکتے ہیں، مگر جن سے میری اپوائنٹمنٹ ہو ان سے ملنا میں ضروری سمجھتا ہوں۔"

دروازہ کھلا اور ادھیڑ عمر کا پروفیسر اندر داخل ہوا۔ اس کے پیچھے پیچھے جمیلہ تھی۔ اسے دیکھ کر ریاض ایک لمحے کے لیے چونکا، پھر بے خبر بن گیا اور ہاتھ پھیلا کر پروفیسر کی طرف بڑھا۔

"آیئے پروفیسر صاحب، آیئے۔"

شوکت چند منٹ تک اسی طرح مٹھیاں کسے، دانت پیسے، آنکھیں خون کیے، جیسے جست بھرنے کے لیے تیار، کھڑا رہا۔ پھر جمیلہ کی انگلیوں کو اپنے بازو پر محسوس کر کے یکلخت ڈھیلا پڑ گیا، جیسے بہت سارا خون اس کے بدن سے شر شر کرتا ہوا نکل گیا ہو۔ اس کی آنکھیں ماند پڑ گئیں اور وہ سر جھکا کر جمیلہ کے پیچھے پیچھے ریاض کے دفتر سے نکل آیا۔

باقی کا رستہ انہوں نے خاموشی سے طے کیا۔ بس میں بیٹھا وہ ٹھہری ہوئی نظروں سے باہر کے اڑتے ہوئے نظر کو دیکھتا رہا۔ فلیٹ میں پہنچ کر وہ سیدھا چارپائی پر بیٹھ گیا۔ جمیلہ کھڑکی میں کھڑی سڑک پر بھاگتی ہوئی موٹر گاڑیوں کو دیکھتی رہی۔ پھر وہ اس کے پاس چارپائی پر آ کر بیٹھ گئی۔

اس نے خاموشی اور تندی سے کئی بار اس کو چوما، پھر اس کی کمر پر ہاتھ دھرے دھرے لیٹ گیا۔

بعد میں وہ دیر تک چارپائی کے پاس کھڑی اسے نیند میں گہرے سانس لیتے ہوئے دیکھتی رہی۔ اس کی گدلے شیشے کی سی آنکھیں نیم وا تھیں اور وہ منہ کھولے بے خبر سو رہا تھا، اور اس کا سنگ مرمر کا سا سفید اور نازک اور قوی بدن، گول گول ابھرے ہوئے شانوں والا اور لمبے لمبے پتلے بازوؤں والا اور سنہرے بالوں سے ڈھکے ہوئے فراخ سینے والا ہموار پیٹ اور تنگ کولھوں والا اور

پھڑکتے ہوئے مضبوط پٹھوں والا اور مچھلی دار گول رانوں والا اور لمبی لمبی پنڈلیوں والا، مغرور اور محبوب بدن بے دم ہوا پڑا تھا۔ وہ چارپائی کو پکڑ کر زمین پر بیٹھ گئی اور آہستہ آہستہ رونے لگی۔

کچھ دیر کے بعد اس نے اٹھ کر دیوار پر لٹکتے ہوئے شیشے میں اپنے بالوں اور چہرے کو درست کیا اور آہستہ سے فلیٹ کا دروازہ بھیڑ کر باہر نکل گئی۔

جب وہ اٹھا تو دھوپ ڈھل رہی تھی۔ اس کے ماتھے پر پسینے کے ننھے ننھے قطرے ابھر آئے تھے۔ ایک بڑی سی سبز رنگ کی مکھی روشن دان کے شیشوں پر مستقل سرمار رہی تھی۔ وہ سیدھا لیٹا اس کے پروں کی یکساں، اداس بھنبھناہٹ کو سنتا اور کمرے میں پھیلے ہوئے سہ پہر کے اجالے کو دیکھتا رہا۔ پھر وہ اٹھ کر کھڑکی میں جا کھڑا ہوا۔ نیچے سڑک پر موٹر گاڑیاں نیلے دھوئیں کے غبار چھوڑتی ہوئی اڑی جا رہی تھیں۔ فٹ پاتھ پر لوگ تیز تیز چل رہے تھے۔ کبھی کبھی وہ دور سے ایک دوسرے کو پہچان کر ہاتھ ہلاتے اور بے دلی سے ہنس کر گزر جاتے۔ ایک بھاری بدن کی بڑھیا ایک بچے کو انگلی سے لگائے اسے ہجوم سے بچاتی ہوئی، کبھی اس سے اور کبھی اپنے آپ سے باتیں کرتی ہوئی گزر رہی تھی۔ ایک بس آ کر رکی۔ اترنے والے چھلانگیں لگا لگا کر اترے اور اپنے اپنے راستوں پر بڑھ گئے۔ چڑھنے والوں نے لائن بنائی، پھر ان میں یکلخت کھلبلی مچ گئی اور وہ ایک دوسرے کو دھکیلتے، کوستے اور پھلانگتے ہوئے بس میں سوار ہونے لگے۔ ایک گداگر عورت، جو باری باری ہر ایک کے آگے ہاتھ پھیلا رہی تھی، ان کے نرغے میں آ گئی اور دھکے کھانے لگی۔ ایک کتا بے خیالی سے سڑک پار کرنے لگا۔ پھر بس شور مچاتی اور دھوئیں کے بادل اڑاتی ہوئی چل پڑی۔ اس کے منہ میں پہلی بدمزگی پھیلنے لگی۔

"پیسہ!" وہ انتہائی بدلی سے بولا: "پیسہ!!"

پھر وہ چند لوگوں کو چونکتے اور غور سے اپنی طرف دیکھتے ہوئے پا کر کھڑکی
سے ہٹ آیا۔ اس نے بدمزگی سے اپنے آپ پر نظر ڈالی اور کپڑے پہننے لگا۔ پھر
وہ فلیٹ کا دروازہ کھلا چھوڑ کر باہر نکل آیا۔

فٹ پاتھ پر گداگر عورت نے اس کے آگے ہاتھ پھیلایا۔ ڈھلتی ہوئی
زرد دھوپ میں فلیٹوں کی عمارتوں کے سائے سڑک کے آر پار لیٹے ہوئے تھے۔
زرد ساری پہنے ایک جوان عورت لہرا کر چلتی ہوئی اس کے پاس سے گزری جو
آنکھوں کو بڑی بھلی لگی۔ پھر ٹھہری ہوئی نظروں میں حرکت پیدا ہوئی اور اس
نے رک کر، پیچھے مڑ کر اس عورت کو دیکھا جو چھوٹے چھوٹے قدم دھرتی، بازو
ہلاتی، بڑی حیا سے سینہ اٹھائے کمر لہراتی ہوئی ماضی کی مانند پرے چلی جا رہی تھی
اور جی کو بڑی ہی اچھی لگ رہی تھی۔ جب وہ اپنے فلیٹ میں گھس گئی تو وہ پھر
منہ اٹھا کر ایک طرف کو چلنے لگا۔ ہاں، چند سال تک وہ بہت ہی خوش رہا تھا، اس
نے سوچا۔ جمال کو پا لینے کے بعد چند سال تک اسے ہوش ہی نہ آیا تھا۔ اپنے
آپ کو اس کے قابل ثابت کرنے کے لیے اس سے جو بھی ہو سکا اس نے کیا
تھا۔ اس نے مبالغہ آمیز سنسنی خیز رپورٹنگ کی بہترین شکل ایجاد کی تھی اور ملک
بھر میں مشہور ہو گیا تھا۔ اس کا روزانہ کالم ملک کے سب سے بڑے اخبار میں
چھپتا تھا اور اس کی مجموعی ریڈر شپ ایک لاکھ کے تخمینے میں تھی۔ بڑے بڑے
عالی شان ایڈیٹر ہاتھ پھیلائے اس کے پیچھے پیچھے پھرتے تھے اور وہ سیدھے منہ
ان سے بات نہ کرتا تھا۔ اس وقت وہ ایک شاندار فلیٹ میں رہتے تھے جسے
جمال نے قدیم سپینش فرنیچر اور قرمزی رنگ کی دبیز انگلش ولوٹین کی ڈریپری
سے آراستہ کیا تھا، جس کے کچن میں چھ فٹ اونچا تین فٹ چوڑا ریفریجریٹر تھا
اور جمال بڑی شان سے سٹول پر بیٹھ کر بجلی کے چولھے پر سٹین لیس سٹیل کے
برتنوں میں کھانا پکاتی تھی (ایک سال کے مختصر عرصے میں یہ سب کیسے ہوا ہو

گیا؟) جس کے سفید ٹیلیفون کی گھنٹی دن رات بجا کرتی تھی اور وہ رائٹنگ ٹیبل
پر جھکا، ریسیور اٹھا کر بڑے اعتماد سے بڑے مصروفیت کے لہجے میں بات کیا کرتا
تھا۔ ہاں، چند سال تک وہ بہت خوش رہا تھا۔ اس لیے کہ یہ سب کچھ وہ جمال کی
خاطر کر رہا تھا، جمال ـــــ (ایک بہت پرانا، جگمگاتا ہوا منظر اس کی آنکھوں
میں ابھرا: اپریل کے آخری دن تھے اور بہار کا زور ٹوٹ چکا تھا۔ فائنل کے
امتحان سے فارغ ہو کر جمال نے اپنے گھر پر سب دوستوں کو چائے کی دعوت دی
تھی۔ ان کے باغ میں بلند قامت سفیدے کے درخت پر سکوت کھڑے تھے اور
سنہری سہ پہر پہ بدلتے ہوئے موسم کا جادو چپ چاپ چل چکا تھا۔ اور اندر وہ
دوستوں کے جھرمٹ میں بڑے اطمینان سے چل پھر رہی تھی۔ اپنے بڑے سے
ڈرائنگ روم کے جس کونے میں وہ پہنچتی "جال ـــــ جال" کی مانوس
آوازیں ابھرتیں اور نوجوان مسرور قہقہے بلند ہوتے اور یوں اس خاص مقام پہ
اس کی موجودگی کی ہر ایک کو خبر ہوتی۔ ایک ایک لڑکے کو، جو اس روز اس
تقریب پہ مدعو تھا، اس بات کا علم تھا کہ وہ شوکت کی تھی اور شوکت اس کا تھا
مگر اس کے باوجود حسد کا جذبہ ناپید تھا۔ وہ سب اس بے راز ہنسی میں گھلے
ہوئے تھے جو جمال کا حصہ تھی اور مکمل طور پر خوش اور مطمئن تھے، اس لیے
کہ جب وہ چلتی تھی تو کمرے کی ساری آرائش ہوا کی طرح اس کے ساتھ
ساتھ چلتی ہوئی معلوم ہوتی تھی اور جب وہ کسی کے سامنے رک کر کوئی معمولی
سی بات کرتی تھی تو اس شخص کے پاس جیسے زندگی کا سارا سہج اور سبھاؤ چلا آتا
تھا اور اپنے ساتھ کاملیت کا وہ احساس لاتا تھا جو دل میں سرور اور ٹھہراؤ پیدا
کرتا ہے، اس لیے کہ وہ ایک ایسی لڑکی تھی جسے اپنی شخصیت کی تکمیل کے لیے
کسی مرد سے محبت کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ صرف مرد اس سے بات کر
کے، اس سے دوستی کا دم بھر کے اپنی تکمیل کرتے تھے۔ آخیر اپریل کی اس

زریں سہ پہر کو چائے کی پیالی ہاتھ میں تھامے، کھڑکی کے پاس اکیلے کھڑے کھڑے اس نے حیرت سے اس سارے منظر کو دیکھا تھا اور اس پر وہ لمحہ آیا تھا ——— وہ بے مثال اور لافانی لمحہ جس میں اس نے پہلی بار اس لڑکی کے وجود کی اصل موسیقی کو محسوس کیا تھا، اس کی اصل مٹی کو، اس کے تار و پود کی اصل بُنتر کو جیسے بجلی کے ایک چمکارے میں دیکھ لیا تھا اور اس نے سوچا تھا کہ وہ ان لڑکیوں میں سے تھی جو نوجوانوں کے خوابوں میں بسا کرتی ہیں اور کبھی کبھار ہی دیکھنے میں آتی ہیں، اور جب دیکھنے میں آتی ہیں تو چاہے دور ہوں چاہے قریب ہوں چاہے کسی اور کی ملکیت ہوں اپنی طبیعت کے تپاک سے اور اپنے جذبے کی حرارت سے اور اپنی اندرونی دمک سے اور دل سوزی سے اور اپنے ذہن کی بنیادی سادگی کی وجہ سے عمر بھر کی یاد بن جاتی ہیں۔ وہ عورتیں جو درحقیقت کسی ایک کی ملکیت نہیں ہوتیں بلکہ دنیا بھر کے مردوں کی مجموعی جمالیاتی جائیداد ہوتی ہیں ——— وہ جگمگاتا ہوا لمحہ آج بھی اس کے ذہن میں روشن تھا ——— یہ سب کچھ وہ جمال کی خاطر کر رہا تھا جو اب اس کی بیوی تھی اور وہ دنیا کا خوش قسمت ترین شخص تھا۔

اسی زمانے میں ریاض کہیں سے شہر میں آن وارد ہوا تھا۔ وہ بنگال کے دورے سے لوٹا تو اس نے ریاض کو اپنے ڈرائنگ روم میں بیٹھے ہوئے پایا۔ وہ پرانے دوستوں کی طرح، سب کچھ بھول بھلا کر، تپاک اور گرمجوشی سے ملے۔ اس نے دیکھا کہ ریاض اب کافی سنجیدہ ہو چکا تھا اور اس کے لب و لہجے میں ہلکی سی اداسی کی جھلک تھی۔ اس نے بتایا کہ وہ ایک روزنامہ خرید رہا ہے اور اس میں تازہ خون ڈال کر اسے شہر کا سب سے بڑا اخبار بنا دینا چاہتا ہے، جس کے لیے اسے شوکت کی مدد کی بھی شاید ضرورت پڑے گی۔ اس نے اسے ہر ممکن تعاون کا یقین دلایا اور دیر تک پرانے وقتوں کی باتیں کرتے رہے۔ اس کے بعد

اس نے باقاعدگی سے ریاض کے اخبار کے لیے لکھنا شروع کر دیا۔ چنانچہ ایک ہی سال کے اندر اندر وہ شہر کے تین بڑے روزناموں میں شمار کیا جانے لگا۔ اب ریاض نے اخبارات کی ایک لڑی بنانے کا فیصلہ کیا اور آغاز کے طور پر ایک ہفت روزہ اور ایک پندرہ روزہ پرچہ نکالا۔ یہ دونوں پرچے بھی بڑے کامیاب ثابت ہوئے۔ ان دنوں میں ان دونوں پر ایک بار پھر دلوں کی ہمسائیگی کا وہ مختصر سا دور آیا تھا۔ جو بہت پہلے کی یاد دلاتا تھا۔ ہاں، چند سال تک وہ بہت ہی خوش رہا تھا۔

مگر ان دنوں میں ہی فضا کے سنہرے زرد رنگ میں ہلکے نیلے رنگ کی آمیزش شروع ہو گئی تھی۔ گو ان دنوں میں اسے پتا بھی نہ چلا تھا، مگر اب یاد کرتا تھا تو بڑا صاف یاد آتا تھا ——— وہ وجود کے ثابت و سالم ہونے کا ایک طرح کا احساس، وہ ساری شخصیت کے یک جا اور مکمل اور بھرے پرے ہونے کا احساس جو لڑکپن میں کبھی وضو کر کے نماز پڑھنے کے بعد (نماز کے دوران میں نہیں، بعد میں) ہوا کرتا تھا اور اس وقت تک رہتا تھا جب تک کہ وضو کسی نہ کسی طرح ٹوٹ نہ جاتا تھا اور جو اولین جوانی کے زمانے میں اس وقت اور صرف اس وقت ہوتا تھا جب کہ وہ کہانی لکھتا تھا۔ اور بخیر و خوبی اسے ختم کر لیتا تھا، وہ وجود کے ثابت و سالم ہونے کا احساس جو بدن میں بڑا سکون اور بڑی قوت پیدا کرتا تھا اب نہیں رہا تھا۔ اور وہ ہمیشہ اسے ملتوی کرتا آیا تھا۔ وہ کامیابی کے راستے پر تیزی سے بڑھا جا رہا تھا، اور کبھی کبھی جب دل کے اس بوجھ کو محسوس کر کے ٹھٹک کر رک جاتا اور اخبار کی رپورٹ کو ادھورا چھوڑ کر قلم میز پر رکھ دیتا اور کرسی سے ٹیک لگا کر سینے کو صاف کرنے کی خاطر اس سنہرے زرد رنگ کو یاد کرتا اور اس نادر و نایاب احساس کو دوبارہ حاصل کرنے کے لیے کہانی لکھنے کا ارادہ کرتا تو فوراً اسے (غیر شعوری طور پر) جرنلزم میں اپنی اونچی (چنانچہ اتنی

ہی نازک) حیثیت کا اور اپنے اعلیٰ معیار زندگی کا خیال آ جاتا اور ساتھ ہی اسے
وقت کی کمی کا احساس ہوتا اور وہ ہمیشہ ٹھنڈی سانس بھر کر کہتا: "اچھا' اس کے
بعد سہی۔" اور قلم اٹھا کر رپورٹ پر جھک جاتا۔ یوں ہمیشہ وہ اس کام کو کسی
انجانے مستقبل پر اٹھا کر رکھتا رہا تھا۔ کتنی ہی بار' کتنے ہی ایسے چمکتے دمکتے ہوئے
روشن خیالات کو اس نے ذہن کے کونوں کھدروں میں دبا دیا تھا' اس خیال سے
کہ مستقبل قریب میں معقول مالی فراغت حاصل کر لینے کے بعد جب وہ اس
قابل نفرت کام کو چھوڑ دے گا (یا بہت کم کر دے گا) اور اسے بہت سا فالتو وقت
ملے گا تو وہ دل جمعی اور سکون کے ساتھ اپنے ان سارے ٹمٹماتے ہوئے روشن
ستاروں کو ایک خوبصورت لڑی میں پروئے گا اور اس کھوئے ہوئے حیات بخش
احساس کو دوبارہ حاصل کر لے گا۔ وہ وقت کبھی نہ آیا تھا۔

وہ اپنی اس دیوانی دوڑ کے چکر میں (جیسے کسی سحر کے زیر اثر) کبھی بھی نہ
تھم سکا تھا اور اس کے ذہن کے وہ روشن کونے آہستہ آہستہ بجھتے گئے تھے۔ حتیٰ
کہ ایک روز قلم گھستے گھستے وہ ایک لحظے کے لئے' جیسے صرف دم لینے کو' رکا تھا
اور پھر نہ چل سکا تھا ـــــ جیسے کہ انجن اپنے رواں رکھنے والے تیل کے ختم
ہو جانے کے بعد بھی اپنی گرمی میں کچھ دیر تک رگڑ کھاتا ہوا چلتا رہتا ہے مگر
جب بند کیا جاتا ہے تو یک لخت جہاں کا تہاں جام ہو جاتا ہے اور پھر نہیں چل
پاتا ـــــ اس وقت اس نے دہل کر اپنے اردگرد نظر دوڑائی تھی اور چاروں
طرف سے اس گہرے گدلے نیلے رنگ کو اڈتے ہوئے دیکھ کر دفعتاً" اسے اس
بات کا احساس ہوا تھا کہ وہ دل کو ہلکا رکھنے والا سنہرا زرد رنگ اب قطعی طور پر
زمانہ ماضی بن چکا تھا۔

اس کے بعد وہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر تین روز تک قلم ہاتھ میں پکڑے
میز پر پھیلے ہوئے سفید کاغذوں پر نظر جمائے بیٹھا رہا تھا اور ایک لفظ تک نہ لکھ

پایا تھا۔ اس نے اپنے ذہن کا کونہ کونہ چھان مارا تھا' مگر کوڑے کرکٹ کے اس
ڈھیر سے اسے زندگی کے رس کا قطرہ تک دستیاب نہ ہو سکا تھا۔ پھر کہانی کی
تلاش سے عاجز آ کر اس نے کہا تھا: "اچھا میں جرنلزم کو آرٹ بناؤں گا۔" اس
وقت سے اس کی گراوٹ شروع ہوئی تھی۔

سکریچ کر کے ایک تیز رفتار کار کو بریکیں لگیں اور سٹیئرنگ وہیل پر بیٹھے
ہوئے خوش پوش نوجوان نے سر باہر نکال کر بے ضرر سی گالی دی وہ سر اٹھا کر
شرمندگی سے ہنسا اور بھاگ کر سڑک پار کر گیا۔ اب سورج غروب ہو چکا تھا۔
فٹ پاتھ پر ابھی تک لڑکے کرکٹ کھیل رہے تھے۔ وہ چلتا چلتا رک گیا اور
نظریں اٹھا کر افق پر دیکھنے لگا۔ اس شہر کی شام ہمیشہ اس کے دل کو بڑی اچھی لگی
تھی یہ ماضی کی ان لمبی لمبی' ہولے ہولے رنگ بدلنے والی شاموں کی طرح کی
شام نہ تھی۔ یہاں جب تک سورج غروب نہ ہوتا تھا دن بڑا کھلا اور روشن کھڑا
رہتا تھا' اور جونہی سورج ڈوبتا تھا ایک عجیب و غریب' ناقابل بیان قسم کا رنگ
ـــــ گلابی اور سرخ اور آتشی اور نیلی نیلی لہروں والا کاسنی ـــــ یک بیک
سارے آسمان پر پھیل جاتا تھا اور رات صرف چند منٹ دور ہوتی تھی۔ ان چند
منٹوں میں شہر کی ساری ابلتی ہوئی آبادی کی حرکت تھم جاتی تھی (یا کہ صرف
تھمتی ہوئی محسوس ہوتی تھی؟) اور سڑکوں کے کنارے بجلی کے بلبوں کی قطاریں
دم بھر میں جل اٹھتی تھیں اور موٹر گاڑیوں کی بتیاں جلنے اور بجھنے لگتی تھیں اور
دیکھتے ہی دیکھتے شہر بھر کا رنگ و روپ بدل جاتا تھا' یہاں تک کہ لوگوں کی
آوازوں میں اور ان کی چال ڈھال میں اور ٹریفک کے شور تک میں غروب سے
پہلے اور غروب کے بعد کا فرق محسوس کیا جا سکتا تھا۔ یہ چند منٹ وہ حد فاصل
تھے جو دو مختلف شہروں کو ایک دوسرے سے جدا کرتے تھے۔ وہ "نو مین زلینڈ"
تھے جس پر کھڑے ہو کر اس شہر کی مخصوص' مستقل' اندرونی دھڑکن کو محسوس

کیا جا سکتا تھا۔ وقت کے اسی مقام پہ، رات کے کنارے پر کھڑے ہو کر بارہا اس
نے اس آبادی کی تیز و تند، بے رحم اور اداس کر دینے والی تال کو سنا تھا اور اس
کی سرد مہری کو اپنی ہڈیوں میں اترتے ہوئے اور دل کی سانس کو مختصر ہوتے
ہوئے دیکھا تھا۔ حتیٰ کہ یہ موسیقی اب اس کے لہو میں دوڑنے لگی تھی۔ اب وہ
انہیں میں سے ایک تھا۔ اس نے جانی پہچانی، لاتعلق نظریں چاروں طرف
پھینکیں۔ کرکٹ کی ایک گیند سن سے اس کے کان کے ایک انچ کے فاصلے پر
سے گزری۔ وہ جبلی طور پر اپنے سر کو بچانے کے لئے جھکا۔ لڑکوں نے بلے ہوا
میں پھینک کر خوشی کا ایک نعرہ لگایا۔ وہ ان سے بچتا بچاتا ہوا چل پڑا۔ آبادی کی
رفتار ابھی تھمی ہوئی تھی۔ یکبارگی اس کے سر پر بجلی کے قمقموں کی قطار کی
قطار دور تک روشن ہو گئی۔ وہ سہم کر دائیں بازو کی ایک لین میں، جہاں
کارپوریشن کی بتیاں ابھی نہیں جلی تھیں، داخل ہوا۔ یہ نیم تاریک لین سنسان
پڑی تھی اور کوئی بندہ بشر دکھائی نہ دیتا تھا۔ صرف سمندری ہوا شاں شاں کرتی
ہوئی چل رہی تھی اور ردی اخباروں کے ورق اس کی ٹانگوں سے لپٹتے ہوئے،
اس کے آگے آگے دور دور تک اڑے جا رہے تھے۔ دو رویہ فلیٹوں میں ایک
ایک کر کے بتیاں روشن ہو رہی تھیں۔ ایک دو منزلہ فلیٹ کی روشن کھڑکی میں
سرخ پردہ پھڑ پھڑا رہا تھا اور اندر سے ریڈیو کے بجنے کی آواز آ رہی تھی۔ بنگ
کراسی "ہندوستان" گا رہا تھا۔ وہ کھڑکی کے نیچے کھڑا ہو کر ماضی کے اس نغمے کو
سننے لگا۔ کھڑکی میں ایک عورت نمودار ہوئی۔ اس نے جھک کر باہر جھانکا، پھر
اندر کسی سے کوئی بات کی اور ہلکا سا قہقہہ لگا کر ہنسی۔ کارپوریشن کی بتیاں بھک
کر کے جل اٹھیں اور ساری لین روشن ہو گئی۔ وہ سہم کر چل پڑا۔ اب رات
پڑ رہی تھی اور شہر کی اصل دھڑکن ——— اپنی مستقل جگہ پر ——— واپس
بیک گراؤنڈ میں پہنچ چکی تھی۔ موٹر گاڑیاں چکا چوند پیدا کرنے والی بتیاں

آنکھوں میں ڈالتی فراٹے سے گزرتی جا رہی تھی۔ کوئی کوئی گاڑی اندر سے
روشن تھی۔ منہ میں سگار (دابے) شارک سکن کے جیکٹ پہنے تنومند مرد
سٹیئرنگ وہیل پر بیٹھے تھے۔ بازو میں ادھیڑ عمر عورتیں زرتار ساریاں پہنے بیٹھی
طمانیت سے باہر دیکھ رہی تھیں، پچھلی سیٹوں پر نو عمر لڑکیاں اور لڑکے بڑے
دھیان سے کومکس پڑھنے میں مصروف تھے۔ خوش شکل، خوش پوش اور صحت
مند کنبے اپنی اپنی "انکم بریکٹ" والے کنبوں سے ملاقات کرنے، ان کے ساتھ
کھانا کھانے، یا ان کے ہمراہ پکچرز جانے کے لیے اڑے جا رہے تھے۔ وہ دیر تک
سڑک کے کنارے رکا ٹریفک کے تھمنے کا انتظار کرتا رہا، پھر گھبرا کر چل پڑا۔
آگے بانکے بدنوں والے نوجوانوں کے گروہ (تنگ پتلونیں پیٹوں پر ہاتھ) جگہ جگہ
کھڑے راہ جاتی لڑکیوں سے ہنسی مذاق کر رہے تھے۔ خوش نما جسموں اور تنگ
لباسوں والی نوعمر لڑکیاں لب چھپائے، پیٹ میں ہنستی ہوئی لہرا کر پاس سے نکل
جاتی تھیں۔ یہ منظر بھی اس کے دل کو بڑا اچھا لگا اور وہ رک کر انہیں دیکھنے لگا۔
سامنے بڑی بڑی دکانیں تھیں جن میں لوگ ہجوم در ہجوم داخل ہو رہے تھے،
نکل رہے تھے۔ ایک کتابوں کی دکان تھی جس میں کبھی کبھار کوئی جا نکلتا اور
جیبوں میں ہاتھ ڈال کر لاتعلق انداز میں چلنے پھرنے لگتا، جیسے عجائب گھر میں
گھوم رہا ہو۔ ٹریفک آہستہ آہستہ دھیما ہونے لگا۔ وہ دوڑ کر سڑک پار کر گیا۔
اب فٹ پاتھ پر اس کے آگے اور پیچھے ایک اژدھام تھا۔ اس ہجوم میں طالب
علم تھے جو دن بھر روزی کمانے کے بعد اب نائٹ سکولوں کو آ اور جا رہے تھے،
اور بیڑی پینے والے غلیظ لکھ پتی تھے جو اپنے اپنے سٹاکوں کو سیل کرانے کے بعد
اب پھر ——— "سالا" اور "گھپلا" اور "بھاؤ" اور "بازار" اور "تیز" اور "
مندا" کرہوئے ——— اسی کی باتیں کر رہے تھے (یہ اس شہر کی مسخرے پن کی
زبان تھی جو سانس کی طرح اس کے بدن میں چلتی تھی، جسے سن کر ایک ایسے

مردہ خچر کے ڈھانچے کا تصور آتا تھا جو یک بیک مردار خور گدھوں کو جھٹک کر اٹھ کھڑا ہو اور آبادی میں آ نکلے اور زور زور سے ہنہنانا شروع کر دے اور جسے سن کر آبادی کا خون سوکھ جائے) اور عورتیں تھیں جو پلاسٹک کے چمکدار پرس جھلاتی‘ اپنے بے تاثر‘ خوبصورت چہرے اٹھائے خرید و فروخت کرتی پھر رہی تھیں‘ اور اسمگلر تھے جو پھیری لگانے والوں کی طرح اپنا ذہن کندھوں پر اٹھائے پھرتے تھے‘ اور چھوٹے چھوٹے اہلکار تھے۔ جو زندگی کی بے حرمتی کے اس قدر عادی ہو چکے تھے کہ ایک ایک پان کھا کر ساری ساری شام وقت ضائع کرتے پھرتے تھے‘ اور رکشا والے گدیوں پر اٹھے ہوئے‘ ہینڈلوں پر جھکے ہوئے سائیکل چلائے جا رہے تھے اور بڈھی امریکن ٹورسٹ عورتیں انہیں دیکھ دیکھ کر محظوظ ہو رہی تھیں‘ اور گداگر بچے بھیک مانگ رہے تھے‘ اور یہ رواں دواں‘ گری پڑی مخلوق منہ کھولے‘ آنکھیں بند کئے‘ وقفے وقفے پر ہڑپ کرتی ہوئی‘ مورکھوں کی طرح جیبوں میں ہاتھ ڈالے سکے کھنکھناتی ہوئی‘ بے خبری سے ہنستی ہوئی ادھر سے ادھر آ جا رہی تھی۔ وہ چاروں طرف نظر دوڑاتا‘ جھینپ جھینپ کر ہنستا ہوا‘ انسانی تعلقات کے ظلم کی کیپٹیل حروف میں لکھی ہوئی اس ان پڑھی داستان سے آنکھ چراتا‘ بچتا بچاتا ہوا نکلتا گیا۔ رستے میں بہت سی روشن اور نیم روشن جگہیں آئیں۔ ایک نیم روشن جگہ پر اس نے ایک پان والے کو تن تنہا اپنی دکان میں بیٹھے‘ سر جھکائے پان لگاتے دیکھا اور اس کے ریڈیو پر ایک بہت پرانی اور مانوس دھن سنی جو یاد کی مانند اس کا تعاقب کرنے لگی۔ اس نے بار بار ذہن پر زور دے کر اس پر نور دھن کو یاد کرنے کی کوشش کی مگر ناکام رہا۔ چلتے چلتے اب وہ کھلے کھلے بنگلوں والے پر فضا علاقے میں آ نکلا تھا جس کی سڑکوں پر اندھے اندھے بلب دور دور جل رہے تھے۔ بنگلوں کے سرسبز لان برقی قمقموں کی روشنی میں آرام سے لیٹے سانس لے رہے تھے۔ دروازوں پر رنگین پردے

سکون سے پھڑپھڑا رہے تھے۔ اندر ان کے مکین بیٹھے تھے۔ سرکاری عہدیدار جو گورنمنٹ کے برسر اقتدار ارکان کی ذاتی زندگی کے مسائل پر گفتگو کر رہے تھے‘ ٹیلیفون پر سینما کی سیٹیں بک کرا رہے تھے اور اپنے مہمانوں سے ملک کی معاشی بدحالی کا گلہ کر رہے تھے اور بڑے بڑے صنعت کار جو اپنے مزدوروں کی ہڑتال پر غم و غصے کا اظہار کر رہے تھے اور اپنی کھڑکیوں سے سرکاری عہدیداروں کے بنگلوں کو تاک رہے تھے۔ ان کی جوان ہوتی ہوئی دوسری نسل چھوٹی چھوٹی ٹولیوں میں بٹی سڑکوں پر سرگرداں تھی۔ کھٹے کی ترش خوشبودار باڑوں کے سائے میں سگرٹوں کے کش لگائے جا رہے تھے اور سڑکوں پر پوری رفتار سے سکوٹر دوڑائے جا رہے تھے۔ چلتے چلتے ایک جگہ پر رک کر اس نے ایک بار پھر ذہن پر زور دے کر مستقل پیچھا کرتی ہوئی اس دھن کو یاد کرنے کی کوشش کی مگر اس کا مقام ماضی اس کی گرفت میں نہ آنا تھا نہ آیا۔ دو سکوٹر دوڑ لگاتے ہوئے زن سے اس کے پاس سے گزر گئے۔ اس نے پرحسرت نظروں سے ان کا تعاقب کیا اور پل کے پل کو اس کی آنکھوں میں وہ ناچتی ہوئی چمک لوٹ آئی اور اس کا بازو بے اختیار صدا کے انداز میں ان کے پیچھے اٹھ گیا اور وہ بہت آہستہ سے‘ تقریباً نرمی سے بولا: "زندہ باد۔" وہ چلا چلا کر‘ سب کو سنا کر اس ماتمی سفر میں ان سنہری جوانیوں کو آشیرباد دینا چاہتا تھا مگر ابھی ابھی اسے پتا چلا تھا کہ اس کا دل مر چکا ہے۔ دل جو بڑی لمبی اور اونچی اڑان والا‘ بڑا ہی شہپر اور جری پرندہ تھا۔

جب وہ اپنے فلیٹ کا دروازہ کھول کر چپکے سے اندر داخل ہوا تو اس کا بچہ زمین پر بیٹھا ایک پتلی سی کتاب کے ورق الٹ رہا تھا۔ کچن سے برتنوں کے بجنے کی اکا دکا آوازیں آ رہی تھیں۔ اسے دیکھ کر بچے کا چہرہ کھل اٹھا اور وہ دونوں

ہاتھ پھیل کر بولا: "ابا۔"

"گڈو۔" اس نے پیار سے پکارا۔ پھر وہ اس کے پاس بیٹھ گیا: "کیا کر رہے ہو؟"

"پڑھ رہا ہوں۔"

"ڈی ڈل ڈی ڈل ڈی ڈل ڈو۔" بچے نے شرارت سے آنکھیں چمکاتے ہوئے دوہرائے۔

"ڈو ڈل ڈو ڈل ڈو ڈل ڈاہ۔"

"ڈو ڈل ڈو ڈل ڈو ڈل ڈاہ۔"

دونوں کھلکھلا کر ہنس پڑے۔ جمال کچن کے دروازے سے جھانک کر مسکرائی اور واپس چلی گئی۔

"کیا کر رہے ہو بیٹے؟" اس نے پوچھا۔

"ایک بار کہا ہے پڑھ رہا ہوں۔"

"ارے! یہ پڑھنے کب سے لگے؟"

"یہ انکل نے دی ہے۔" بچہ کتاب اس کی ناک کے نیچے ٹھونس کر بولا۔

"کس نے؟"

"انکل ریاض نے۔"

اس نے کتاب کو الٹ پلٹ کر دیکھا۔ اس کی جلد پر لکھا تھا: "بچوں کے لئے زریں اقوال۔"

"ہا ہا۔" وہ ورق الٹنے لگا۔

"ہا ہا۔" بچے نے نقل اتاری اور بازو اس کی گردن میں حمائل کر کے جھولنے لگا: "میں اس کو پڑھ لیتا ہوں۔"

"ارے واہ۔ آپ کو الف بے تو ابھی آتی نہیں۔"

"میں اس کو پڑھ لیتا ہوں۔" بچے نے سختی سے کہا۔

"اچھا پڑھو۔"

"یہ ہے: ہمیشہ سچ بولو۔"

"ارے!" وہ چونک پڑا: "یہ آپ نے پڑھنا کب سے شروع کیا بھئی؟"

"یہ انکل ریاض نے لے کر دی ہے۔"

"ہا ہا۔" اس نے کتاب فرش پر رکھ دی: "آپ کو الف بے تو ابھی آتی نہیں۔"

"میں اس کو پڑھ لیتا ہوں پڑھ لیتا ہوں پڑھ لیتا ہوں۔"

"شوکی۔" جمال کچن کے دروازے پر نمودار ہوئی: "گڈو کا ذہن بڑا ہی اچھا ہے۔"

"اچھا؟"

"ہاں۔" وہ اس کے پاس آ کر زمین پر بیٹھ گئی: "میں نے ایک بار بس بتایا ہے اور اسے ازبر ہو گیا ہے۔"

"ہا ہا۔"

"گڈو ابا کو پڑھ کر سناؤ"

"یہ ہے: "ہمیشہ سچ بولو۔" بچے نے کہا۔

"اہا۔"

"یہ ہے: "محنت سے کام کرو۔"

"ہا ہا۔" اس نے پیار کے مارے جھک کر اپنے بچے کو ماتھے پر چوما: "ڈو ڈل ڈو ڈل ڈاہ۔"

"ڈو ڈل ڈو ڈل ڈاہ۔" بچے نے دوہرایا۔

"ڈی ڈل ڈی ڈل ڈو۔"

"ڈی ڈل ڈی ڈل ڈو۔"

دونوں قہقہہ لگا کر ہنس پڑے۔ اس نے "ڈو ڈل ڈو ڈل" کی گردان کرتے ہوئے بچے کے گدگدی کرنی شروع کر دی۔ بچہ ہنستا ہوا فرش پر قلابازیاں کھانے لگا۔ لڑھکتا لڑھکتا وہ دور تک چلا گیا۔ دیوار کے پاس پہنچ کر اس کا ہاتھ ایک ٹوٹے ہوئے کھلونے پر پڑا۔ وہ اسے اٹھا کر کچھ دیر تک خاموشی سے دیکھتا رہا' پھر چلا اٹھا:

"ابا میرا جہاز ٹوٹ گیا۔"

"ارے یہ کیسے ٹوٹ گیا؟"

"بس ٹوٹ گیا۔" بچے نے کہا: "ابا ہمیں جہاز بنا کر دو۔"

"جہاز بنا کر دیں؟"

"ہمیں جہاز بنا کر دیں۔"

"اچھا۔" اس نے کتاب سے ورق پھاڑ کر جہاز بنانا شروع کیا۔

"ابا" بچہ چیخا: "اس کا نہیں' اخبار کا۔"

"اخبار کا؟" وہ جہاز بناتا رہا۔

"ابا آپ نے ہمارا "ہمیشہ سچ بولو" پھاڑ دیا ہے۔"

اس نے جہاز بنا کر دو انگلیوں میں پکڑا اور منہ سے "زوم" کی آواز نکال کر زور سے ہوا میں پھینکا۔

"ابا ہم کو دیں۔" بچہ ہاتھ پھیلا کر اس کے پیچھے بھاگا جہاز کھڑکی کے راستے تیرتا ہوا نیچے سڑک کی طرف پرواز کر گیا۔ بچے نے خوشی سے تالی بجائی۔ وہ دوسرا ورق پھاڑ کر جہاز بنانے لگا۔

"ابا اس کا نہیں۔" بچہ چیخا: "ابا آپ نے ہمارا محنت سے کام کرو' پھاڑ دیا۔" "ارے ہاں یار۔" وہ اکتا کر بولا: "ہم نے بھی پڑھا تھا۔" اور جہاز بناتا

رہا۔

"ہم کو دیں —— ابا ہم کو دو۔" بچہ چلایا۔ پھر اس نے باپ کے ہاتھ سے جہاز لے کر اسے دو انگلیوں میں پکڑا اور منہ سے "زوم —— زوم" کی آوازیں نکال نکال کر اسے کمرے میں اڑانے اور تالیاں بجانے لگا۔

جمال' جو اس اثنا میں واپس کچن میں جا چکی تھی' دوبارہ دروازے پر نمودار ہوئی اور بولی: "شوکی کھانا تیار ہے۔"

"ارے جیتی رہو فاختہ۔" وہ بولا: "مجھے بھوک لگ رہی تھی۔"

اس نے خاموشی اور تندی سے کھانا کھایا۔ کھانا ختم کرنے کے تھوڑی ہی دیر بعد بچہ ماں کی گود میں پڑا سو گیا۔

جب وہ بتیاں بجھا کر سونے کے لیے لیٹے تو کمرے میں سخت حبس ہو رہا تھا اور کئی پتنگے ادھر ادھر تاریکی میں دیواروں اور کھڑکیوں کے شیشوں پر سر مار رہے تھے۔

"نہیں شوکی۔" پھر جمال کی آواز آئی: "آوں ہنک۔"

"میری فاختہ —— میری ننھی سی فاختہ۔"

"ہائے شوکی —— تمہیں کیا ہو گیا ہے؟"

"میری جان فاختہ۔" وہ خوشامد کے لہجے میں بولا: "میری جال فاختہ۔"

"خدایا!" اس نے زاری کی: "خدایا!"

اگلے روز سویرے وہ ریاض کے ڈرائنگ روم میں بیٹھی تھی۔ اس کے سامنے ریاض' سفید فلالین کی پتلون اور زرد پولو شرٹ پہنے' صوفے پر نیم دراز پچھلے ایک گھنٹے سے مستقل ٹیلیفون پر اپنے آفس سے بات کر رہا تھا۔ گڈو اکیلا اکیلا برآمدوں میں پھرتا ہوا آ کر اس کے پاس بیٹھ گیا۔

"امی" وہ بولا: "میں سڑک پر چلا جاؤں؟"

"نہیں۔"

"امی۔" تھوڑی دیر بعد اس نے پھر پوچھا: "میں سڑک پر چلا جاؤں؟"

"نہیں گڈو۔" وہ سختی سے بولی: "آپ سڑک پر نہیں جا سکتے۔"

وہ صوفے پر بیٹھا زور زور سے ٹانگیں ہلانے لگا۔ ریاض نے ریسیور رکھ دیا اور سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔

"ہم اخبار نویسوں کی بھی عجیب زندگی ہے۔" وہ بولا: "اتوار کے روز بھی چین نہیں ملتا۔"

"مجھے پتا ہے۔" وہ ہنسی "میں نے ایک اخبار نویس سے شادی کی ہے۔"

ریاض نے گہری، اداس نظروں سے اسے دیکھا۔ وہ جھجک کر ادھر ادھر دیکھنے لگی۔ دیواروں پر بڑی بڑی فریم شدہ پینٹنگز کے درمیان پرانے پرانے گروپ فوٹو لٹکے تھے۔ چاروں طرف میزوں پر ریاض کی ان گنت ٹرافیاں اور چھوٹے بڑے کپ، جن کا روغن اب اترتا جا رہا تھا، بے ترتیبی سے رکھے ہوئے تھے۔ کھڑکیوں کے سبز پردے اکٹھے کر کے پیتل کے چھلوں میں پھنسا دیے گئے تھے اور خوش گوار سمندری ہوا کمرے کے آرپار چل رہی تھی۔ یہ اتوار کا روز تھا (صبح اٹھ کر اس نے دو چار بار شوکت کو جگانے کی کوشش کی تھی، پھر گڈو کو ناشتہ کرا کے، فلیٹ کا دروازہ آہستہ سے بھیڑ کر یہاں چلی آئی تھی۔)

اب باہر گھاس کے قطعوں پر دھوپ پھیل چکی تھی اور فٹ پاتھ پر لڑکے کرکٹ کھیل رہے تھے۔ ("امی میں سڑک پر چلا جاؤں؟" گڈو نے تیسری بار پوچھا۔) وہ اس کے گھر میں پہلی بار داخل ہوئی تھی، اس نے سوچا۔ صرف ایک مرتبہ پہلے، جب ریاض نیا نیا اس شہر میں آیا تھا اور وہ اپنے کالج سے (جہاں اس نے محض دفع الوقتی کی خاطر کچھ دیر کے لیے نوکری کر لی تھی) واپسی پر بس کا انتظار کر رہی تھی تو ریاض کی سبز رنگ کی بیوک اس کے برابر آ کھڑی ہوئی

تھی۔ اندر وہ دونوں کہنیاں سٹیرنگ پر رکھے عجیب پر حسرت نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔

"ہلو ریاض۔" وہ خوشی سے بولی تھی۔ (ایک زمانے میں وہ کتنی خوش رہی تھی، اس نے یاد کیا۔)

"کیسی ہو جال؟" ریاض نے پوچھا تھا۔ اور اس کے لہجے کے حزن کو محسوس کر کے اس کا دل بھر آیا تھا۔ پھر جب اس نے کہا تھا: "چلو تمہیں چھوڑ آؤں۔" تو وہ چپکے سے موٹر کا دروازہ کھول کر اس کے ساتھ بیٹھ گئی تھی، اور جب رستے میں اس نے یہ کہہ کر کہ "چلو تمہیں اپنا گھر دکھاؤں۔" گاڑی اپنے گھر کی طرف موڑ دی تھی تو بھی وہ کچھ نہ بولی تھی۔ پھر وہاں پہنچ کر وہ اسے اپنے بڑے سے، جہاز نما مکان کے وسیع و عریض لان اور نفاست سے کٹی ہوئی باڑیں اور گلاب کے پودے دکھاتا پھرا تھا۔ (اپنے لاپروا، بااختیار انداز میں، بچوں کی سی بڑائی کے لہجے میں جو نو دولتیے طبقے کے غرور سے یکسر مبرا تھا بہر حال، اس نے یاد کیا۔) پھر اس کے اصرار پر وہ اسے اس کے گھر چھوڑ آیا تھا۔ آج تن تنہا، گڈو کو انگلی سے لگائے اس کے گھر میں داخل ہوتے ہوئے اسے بڑا عجیب سا لگا تھا۔

"شوکت آیا تھا۔" ریاض نے کہا۔

"کب؟"

"کل۔"

ٹیلیفون کی گھنٹی پھر زور زور سے بجنے لگی۔ چند سیکنڈ تک وہ تھکی ہوئی نظروں سے اس سرد، بے روح آلے کو دیکھتا اور اس کی تیز و تند آواز کو سنتا رہا، پھر میکانکی طور پر ریسیور اٹھا کر بولا: "ہلو۔"

اپنی چھوٹی چھوٹی مونچھوں پر انگلی پھیرتا ہوا وہ دوسری طرف سے آتی ہوئی آواز کو سنتا رہا، پھر تیزی سے بول اٹھا:

"خواجہ صاحب سے کہو' سپورٹس مین کو آج شام کے پلین میں سیٹ ریزرو کرا دیں اور اس کے لیے پیسوں کا بندوبست کر دیں۔ آج اسے ہر حالت میں چلے جانا چاہیے۔ اور انور سے کہو منسٹری آف انفارمیشن سے نمبر ٹو زیرو سیون کے بارے میں مکمل رپورٹ حاصل کر کے چار بجے تک مجھے پہنچا دے۔ اور وہ آرٹیکل تیار ہو گیا؟ ٹھیک ہے۔ پریس میں جانے سے پہلے میں ایک نظر اسے دیکھنا چاہتا ہوں۔ اور چیمبر آف کامرس والی تقریر ——— ایں؟ اچھا اچھا' مگر اب چار بجے تک مجھ کو مت ڈسٹرب کرو۔ اور آپریٹر سے بھی بول دو کہ چار بجے تک میں "آؤٹ" ہوں' سب کالز کو روک کر رکھے۔ او کے؟" اس نے ریسیور پٹخ دیا۔

پھر ایک لحظہ رکنے کے بعد صوفے کی پشت سے ٹیک لگا کر بولا: "میں نے اس کی ہر ممکن مدد کرنے کی کوشش کی ہے جال' مگر وہ اپنی بات پر اڑا ہوا ہے۔ کسی کی بات ہی نہیں سنتا۔ ایک دم سنگل ٹریک مائنڈ ہوتا جا رہا ہے۔ جرنلزم بڑا نازک بزنس ہے۔ اس کے چند بنیادی اصول ہوتے ہیں' تمہیں پتا ہی ہے۔ ان کے ساتھ گھپلا کرنے کی میں اسے اجازت نہیں دے سکتا۔"

"انکل" بچے نے جیب سے کتاب نکال کر بڑھائی: "ہمیں جہاز بنا کر دیں۔"

"ارے' یہ آپ نے پھاڑ دی؟"

ابا نے اس کے جہاز بنا دیے۔" بچہ معصومیت سے بولا۔

"ہا ہا۔" وہ کتاب لے کر اس کے ورق الٹنے لگا: "اس کو پڑھتے ہیں بیٹے۔"

"ہمیں جہاز بنا کر دیں۔" بچے نے ضد کی۔

"اس کو پھاڑتے نہیں بیٹے۔ اس پڑھتے ہیں۔" وہ نرمی سے بولا۔

"پھر؟"

"پھر پڑھ کر بڑے آدمی بنتے ہیں۔"

"نہیں ہمیں جہاز بنا کر دیں۔" بچے نے رونی آواز میں دوہرایا۔

ٹیلیفون کی گھنٹی پھر بج اٹھی۔ اس نے جھنجھلا کر فون اٹھایا اور تیزی سے بولا: "ہلو۔" پھر ایک سیکنڈ کے بعد پرتپاک لہجے میں: "اخاہ ——— کرنل صاحب ہیں۔ یہ آپ کہاں غائب ہو گئے تھے جناب؟ پوچھتے پوچھتے ہمارا دم نکل گیا۔" ریسیور کے اوپر سے اس نے جمال سے نظر ملا کر منہ بنایا اور جھلاہٹ سے کندھے اچکائے۔ پھر صوفے پر نیم دراز ہو کر بڑے شگفتہ لہجے میں باتیں کرنے لگا۔

پچھلے ایک گھنٹے میں وہ اسی طرح (اپنے لاپروا' بااختیار اور شگفتہ لہجے میں) اپنے چیف ایڈیٹر' چیف رپورٹر' پریس سپرنٹنڈنٹ اور کوئی آدھی درجن سب ایڈیٹروں سے بات کر چکا تھا۔ اس کے علاوہ بیچ بیچ میں اس نے کئی بار اپنی سیکرٹری کو مختلف ہدایات دی تھیں اور ہر بار اسے سختی سے تنبیہہ کی تھی کہ اب چار بجے تک اس کو ڈسٹرب نہ کیا جائے۔ جمال نے اس سارے عرصے میں پہلی بار غور سے اسے دیکھا اور دہل کر رہ گئی۔ بے آرامی کی وجہ سے اس کی آنکھوں کے گرد گہرے سیاہ حلقے پڑ گئے تھے اور اس کا جسم نمایاں طور پر دبلا ہوتا جا رہا تھا۔ ٹیلیفون پر باتیں کرتے ہوئے وہ پائپ بھرتا جا رہا تھا۔ پائپ سلگاتے ہوئے اس کا ہاتھ کانپ رہا تھا اور اس کی ایک ٹانگ مستقل ہلے جا رہی تھی وہ اپنی ابلتی ہوئی اعصابی قوت سے مجبور تھا اور ایک وقت میں کئی کئی کام کرنا چاہتا تھا۔ اس کی کنپٹیوں کے بال تقریباً سفید ہو چکے تھے اور اس کے جسم کی تیز' مضطرب حرکات کے باوجود اس کے چہرے سے مستقل تھکن اور ناطاقتی مترشح تھی۔ یہ شخص ——— ایک لحظے کے لیے جمال نے آنکھیں بند کر کے سوچا

یہ شخص ٹریک پر یوں دوڑا کرتا تھا جیسے جنگل میں چیتا دوڑتا ہے۔

ہاں ——— اس نے یاد کیا ——— ریاض احمد زبیری بڑا ہی شاندار آدمی تھا۔ وہ دن، جب پہلی بار اس نے ریاض کا نوٹس لیا، اس کے ذہن پر بڑا گہرا نقش تھا۔ جاڑوں کے دن تھے۔ وہ یونیورسٹی گراؤنڈ کے ساتھ ساتھ چلی جا رہی تھی کہ اچانک اس کی نظر ایک لڑکے پر پڑی جو اونی ٹریک سوٹ میں ملبوس، سپائنگ پہنے دوڑ کی پریکٹس کر رہا تھا۔ وہ ٹھٹک کر رک گئی۔ پھر اس نے کئی بار حیرت سے آنکھوں کو جھپک کر اسے دیکھا اور دیکھتی رہ گئی۔ ایسے گریس فل سٹائل سے اس نے آج تک کسی کو دوڑتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ اس لڑکے کے پاؤں زمین پر لگتے ہوئے دکھائی ہی نہ دیتے تھے اور اس کی ٹانگیں جیسے ہوا ہی ہوا میں کک پر کک لگاتی ہوئی، پوری رفتار سے بدن کو اڑائے لیے جا رہی تھی۔ اسے دیکھ کر یوں محسوس ہوتا تھا کہ جیسے ابھی، اسی لمحے یہ بدن زمین کو بالکل ہی چھوڑ دے گا اور بازو پھیلا کر اسی آسانی اور تیزی کے ساتھ ہوا میں اڑنا شروع کر دے گا۔ اس کے بازوؤں کی، پشت کی، کندھوں کی، گردن کی، سر کی، ٹانگوں کی اپنی اپنی حرکت جیسے سارے بدن کی ایک اندرونی تال کے ساتھ بندھی ہوئی تھی۔ اس کے سارے بدن کی مجموعی حرکت میں ایسا مکمل آہنگ تھا جیسا ایک سمفنی میں ہوتا ہے۔ چار سو چالیس گز کے گول ٹریک پر اس کے لیے لڑکے کی دوڑ ایک عظیم الشان سمفنی کی گونج تھی۔

جب وہ اچھی طرح سے "وارم اپ" ہو چکا تو اس نے ٹریک سوٹ اتار کر ایک طرف رکھ دیا۔ نیچے صرف سیاہ سلک کے انڈرویئر میں اس کا گٹھا ہوا سفید جسم سہ پہر کی دھوپ میں چمکنے لگا۔ وہ کتنی ہی دیر تک آنکھیں جھپکتی ہوئی کھڑی اسے دیکھتی رہی اور وہ سر گرائے چکر پہ چکر لگائے گیا۔

اس کے بعد کتنی ہی بار اس کی آنکھوں کے سامنے اس چمکدار

خوبصورت جسم نے بڑے بڑے معرکے سر کیے۔ سائیڈ لائینز پر دم بخود کھڑے کھڑے، یا جوش سے چلا چلا کر تالیاں پیٹتے ہوئے اس نے اسے ہاکی کے میدان میں اپنے جسم پر مکمل کنٹرول کا مظاہرہ کرتے ہوئے دیکھا۔ اس کا "باڈی ڈاج" ملک بھر کے کھلاڑیوں میں مشہور تھا۔ جب وہ گیند لے کر نکلتا تو دس دس پندرہ پندرہ گز کے فاصلے پر مقابل کے کھلاڑی پلٹ پلٹ کر گرنے لگتے۔ اسے اپنے جسم پر یوگیوں کا سا کنٹرول حاصل تھا۔ کیمپس پر وہ ہر دم اس کی نظروں کے سامنے رہتا۔ وہ ایک ہی وقت میں ساری جگہوں پر حاضر و ناظر معلوم ہوتا۔ اس کی یہی ابلتی ہوئی اعصابی قوت تھی جس نے اس کی شخصیت میں بلا کی کشش پیدا کر دی تھی۔ آہستہ آہستہ وہ دل ہی دل میں اس کی گرویدہ ہوتی گئی۔ (اس کی اسی گرویدگی نے لمبے عرصے تک اسے ایک جان لیوا کشمکش میں مبتلا رکھا تھا۔ وہ ان دو مردوں کے درمیان جیسے ہوا میں معلق کھڑی رہی تھی، کھڑی رہی تھی حتیٰ کہ عورت کی مخصوص چھٹی حس نے اسے بتایا کہ وہ مکمل ہم آہنگی، جو ایک عورت اور مرد کے درمیان ہو سکتی ہے، صرف شوکت کے ساتھ ممکن تھی۔ شوکت ——— جو ریاض کی طرح شاندار نہ تھا مگر جس کی کشش قریب جانے پر محسوس کی جا سکتی تھی، جس میں قدرتی ذہانت کی آہستہ آہستہ اٹھنے والی، ہمیشہ جلنے والی ایک دمک تھی جو کہیں اندر سے ان دیکھی، طاقتور شعاعوں کی طرح نکلتی رہتی تھی اور جو قریب آنے والے ہر شخص میں خیروعافیت کا عجیب سا احساس پیدا کرتی تھی، وہ جو ریاض کے مقابلے میں زندگی کی بڑی بڑی اہم اور سنجیدہ باتوں کا اہل تھا ——— اس نے یاد کیا ——— جس کے جسم کی وہ مدھم، قدرتی باس تھی جسے محسوس کر کے آج بھی اس کا بدن سلگ اٹھتا تھا ——— خدایا!)

ریاض ٹیلیفون سے فارغ ہو کر سیدھا ہو بیٹھا اور جمائی کو روکنے کی کوشش کرنے لگا۔

"گڈووو۔" پھر اس نے آواز دی۔

بچہ، جو اس کی ٹرافیوں کا ملاحظہ کر رہا تھا، ہاتھ پھیلا کر اس کی طرف بھاگا: انکل ہمیں جہاز بنا کر دیں۔"

"آیئے آیئے ——— ار ر ر ر یہاں بیٹھ جایئے ار ر ر یہاں ہمارے پاس۔ شاباش۔"

"انکل جہاز ———"

"آپ پہلے اس کو پڑھیں۔" اس نے کتاب بچے کے ہاتھ میں پکڑائی: "پھر ہم آپ کو سچ مچ کا جہاز لے کر دیں گے۔"

"سچ مچ کا جہاز؟"

"ہاں۔" اس نے تیزی سے جمال کو دیکھا: "میں ایک ٹوسیٹر پلین خرید رہا ہوں۔"

"کس لیے؟" جمال نے پوچھا۔

"کس لیے؟ اڑانے کے لیے۔"

"اڑا لیتے ہو؟"

"میرے پاس لائسنس ہے بھئی۔" وہ بولا: "کل ملا کر میری آٹھ سو گھنٹے کی فلائنگ بنتی ہے۔"

جمال نے ابرو اٹھا کر داد دی۔

"پھر میں تمہیں آسمان کی سیر کراؤں گا۔ ہیں؟" وہ ہنسا

وہ سامنے دیوار پر دیکھتی رہی۔

"یہ میں نے پارسال خریدی تھی۔" وہ بولا۔

"پرنٹ ہے؟"

"پرنٹ؟؟ میں نے آج تک یہاں کوئی پرنٹ نہیں لٹکایا، یہ سب۔" اس

نے ہاتھ پھیلایا "یہ سب اوریجنل ہیں۔"

"اوہ ———"

"اب میں یہیں میورلز بنوا رہا ہوں۔" اس نے سامنے کی دیوار کی طرف اشارہ کیا۔ پھر وہ اس بے خیالی سے دیوار پر گھورتے ہوئے دیکھ کر اٹھ کھڑا ہوا: "تم نے میرا مکان دیکھا ہے؟ آؤ تمہیں دکھاؤں۔"

"اوہ ———" وہ ہنسی: "بڑا اچھا مکان ہے۔"

"تم نے دیکھا کب ہے بھئی۔ آؤ میرے ساتھ۔"

"انکل جہاز ———" بچے نے کہا مگر وہ دونوں ساتھ ساتھ دروازے سے باہر جا چکے تھے۔

"یہ بینکوئٹ ہال ہے۔" ریاض نے کہا۔ یہ ایک بہت بڑا مستطیل کمرہ تھا جس کے فرش کی سیاہ اور سفید ٹائلوں پر پاؤں پھسلا جاتا تھا۔ وسط میں سیاہ، چمکدار لکڑی کی بھاری پایوں والی میزیں، زرد سلک کی چادروں سے ڈھکی ہوئی میزیں بچھی تھیں جن پر چمکدار چاندی کے بڑے بڑے پیالے اور دوسرے آرائشی برتن رکھے تھے۔ دیواروں کے ساتھ سرخ اور سیاہ رنگ کے صوفے بچھے تھے جن کے آگے چھوٹی چھوٹی گول میزیں پڑی تھیں۔ چاروں طرف اونچی اونچی، چھت تک پہنچتی ہوئی، پلیٹ گلاس جڑی کھڑکیاں تھیں جن کے آگے سبز رنگ بھاری سلک کے گھنی سلوٹوں والے پردے لٹک رہے تھے۔ کھڑکیوں کے بیچ بیچ دیواروں پر بڑی بڑی سنہری فریم شدہ تصویریں لگی تھیں۔ چھت کے عین وسط میں بہت بڑا، شیشے کی ہزاروں بتیوں والا فانوس لٹک رہا تھا۔

"یہ فانوس" ریاض نے کہا: "میں نے چیکوسلواکیہ سے منگوایا ہے۔" اس نے تک سے بٹن دبایا اور سارا ہال بقعہ نور بن گیا۔ جمال کی آنکھیں چندھیا گئیں۔

"دنیا بھر میں صرف چیکو سلواکیہ میں کٹ گلاس کا کام اتنا عمدہ ہوتا ہے۔" ریاض کہہ رہا تھا۔ خیرہ آنکھوں سے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے اس نے ریاض کے پیچھے پیچھے ہال کا فرش پار کیا اور اگلے کمرے میں داخل ہوئی۔

"یہ کاک ٹیل لاؤنج ہے۔" ریاض نے بتایا۔ اندر داخل ہوتے ہی ان کے آدھے آدھے پاؤں قالین میں دھنس گئے۔ اس کمرے میں سارا قدیم سپینش فرنیچر تھا اور کھڑکیوں پر قرمزی ولوٹین کے بھاری پردے چھت سے لے کر فرش تک لٹک رہے تھے۔ دائیں طرف کی ساری دیوار کے ساتھ ساتھ اخروٹ کی لکڑی کا بار تھا جس کے آگے اونچے اونچے گھومنے والے سٹول پڑے تھے۔ کاؤنٹر کے ایک طرف سیاہ پتھر کا بہت بڑا فرشی لیمپ کھڑا تھا۔

"سپینش فرنیچر تمہیں پسند ہے نا؟" ریاض کہہ رہا تھا: "یہ سارا سپین سے برآمد کیا گیا ہے۔ اور یہ ولوٹین۔" اس نے ہاتھ بڑھا کر پردے کو چھوا۔

ایک تنگ سے کوریڈور میں سے گزرتے ہوئے ریاض نے سرسری طور پر ایک دروازہ کھولا: "یہ باتھ روم ہے۔" اس کہا۔ غسل خانہ اچھے بھلے کمرے کے سائز کا تھا جس کے کونے میں بجلی کا واٹر ہیٹر نصب تھا۔ اس کا فرش اور آدھی آدھی دیواریں ہلکی سبز ٹائلوں کی تھیں اور فرش کے وسط میں سرخ پتھر کا ایک چھوٹے سے سوئمنگ پول کے سائز کا ٹب زمین کے اندر نصب کیا گیا تھا۔ میڈیسن کیبنٹ پر بیسیوں چھوٹی بڑی شیشیاں رکھی تھیں اور دونوں جانب قد آدم آئینے لگے تھے۔ واش بیسن اور ٹب کی ٹونٹیاں سونے کے رنگ کی تھیں۔ ریاض نے اندر جا کر ساری ٹونٹیاں کھول دیں اور ٹھنڈا اور گرم پانی شر شر بہنے لگا۔ وہ جمال کی طرف دیکھ کر آہستہ سے ہنسا اور باہر نکل آیا۔

کوریڈور کو عبور کر کے وہ ریاض کی سٹڈی میں داخل ہوئے۔ یہ نسبتاً چھوٹا کمرہ تھا جس میں اخروٹ کی لکڑی کے شیلف چھت تک کتابوں سے پر

تھے۔ ایک بڑا سا چمڑے کا صوفہ میز کے پاس بچھا تھا۔ صوفے کے پیچھے زرد رنگ کے شیڈ والا فرشی لیمپ روشن تھا۔ ایک کونے میں میز پر فونوگراف پڑا تھا۔ پاس ہی ریکارڈوں سے لدی ہوئی ایک بہت بڑی کیبنٹ تھی۔ چند ریکارڈ میز پر بکھرے تھے۔ کھڑکیوں اور دروازوں پر بھاری بھاری پردے لٹک رہے تھے جنہوں نے باہر کی دنیا کو یکسر روک رکھا تھا۔ اس کمرے میں مکمل سناٹا تھا۔ جمال آہستہ سے میز کے کونے پر بیٹھ گئی۔

"کبھی پڑھی بھی ہیں؟" اس نے کتابوں کی طرف اشارہ کر کے خوش دلی سے کہا۔

"ہا ہا۔" ریاض نے جا کر سٹڈی کا دوسرا دروازہ، جو خواب گاہ میں کھلتا تھا، کھول دیا: "یہ بیڈ روم ہے۔"

اس کمرے کے فرش پر قدم رکھتے ہی ان کے پاؤں سارے کے سارے قالین میں دھنس گئے۔ یہاں سب چیزیں نیلگوں شیڈ کی تھیں، جیسے شام پڑی ہوتی ہے۔ لمبی لمبی گہری سلوٹوں والے پردے اور ٹیبل لیمپوں کے شیڈ اور لمبے چوڑے بستر پر پھیلی ہوئی چادریں اور تپائی پر پڑا ہوا ٹیلیفون اور کرسی پر پھینکا ہوا نائٹ سوٹ اور نفاست سے جوڑ کر رکھے ہوئے مخملیں سلیپر اور اخباروں رسالوں کے فولڈر اور فرش پر بچھا ہوا قالین —— سب کا شیڈ گہری شام کا سا نیلگوں تھا۔

"یہ قالین دو سو برس پرانا ہے۔" ریاض کہہ رہا تھا: "میں کابل کے قالین سازوں کے بازار میں گھوم رہا تھا کہ اچانک اس پر نظر پڑ گئی۔ اس کی پوری ہسٹری کی کتاب اس کے ساتھ تھی۔ دو سو برس پیشتر یہ بخارا کے قالین سازوں نے بنایا تھا۔ پھر یہ کہاں کہاں گیا اور کن کن ہاتھوں سے نکلا؟ یہ سب اس میں درج تھا۔ ایک لاکھ بیس ہزار افغانی روپے اس کی قیمت تھی۔ تقریباً

تیس ہزار روپے بنتے ہیں ——

"دو سو برس' ذرا سوچو! اور یہ ابھی تک ویسے کا ویسا ہے۔ دیکھو۔" اس نے کہا: پاؤں نکال کر دیکھو۔" اور اپنا پیر جوتے سے نکال کر اس پر پھیرنے لگا: " دیکھو —— " اس نے دوہرایا۔ پھر وہ گھٹنے ٹیک کر زمین پر بیٹھ گیا اور اس کا پاؤں جوتے سے نکالنے لگا۔

جمال نے اپنے چھوٹے سے دبلے پتلے پاؤں کو دور تک قالین میں دھنستے ہوئے دیکھا اور وہ جھاگ سی کیفیت اس کے دل کو بڑی اچھی معلوم ہوئی۔ چند لمحے تک وہ پاؤں کو وہیں رکھے کھڑی رہی اور مخملیں پشم اس کی جلد پر ہلکی ہلکی گدگدی کرتی رہی: "دو سو برس پہلے۔" ریاض کی آواز جیسے کہیں دور سے آ رہی تھی: "ذرا سوچو! بخارا' سمرقند ——" دنیا میں کیسی کیسی عجیب و غریب جگہیں ہیں' اس نے سوچا۔ دفعتاً اس نے اپنے آپ کو دو سو برس پہلے کے زمانے میں سمرقند بخارا کے شاہی محلوں میں کھڑا ہوا پایا۔ اسے محسوس ہوا کہ جیسے وہ کسی شاہی تقریب میں شرکت کرنے کے لیے تیار ہو رہی ہے اور خادم گھٹنے ٹیکے' نظریں جھکائے' جوتا ہاتھ میں اٹھائے اس کے حکم کا منتظر بیٹھا ہے اور وہ اس سارے نیم تاریک' پراسرار محلوں کی اور ان کے بیش بہا ساز و سامان کی اور درجنوں مئودب خادموں کی مالک ہے اور ایک انگلی کے اشارے سے کیا سے کیا کر سکتی ہے۔ کئی طویل لمحوں تک وہ ایک سکتے کے عالم میں بے حس و حرکت کھڑی رہی اور ریاض اسی طرح بیٹھا نظریں اٹھائے حیرت سے اسے دیکھتا رہا۔

پھر یک لخت اس کا سفر ختم ہو گیا اور وہ سارے قدیم زمانوں اور ان کے سارے نیک تاریک' پراسرار جذبوں کو طے کر کے واپس آ گئی اور اس ہولے ہولے سر اٹھاتی' گدگدی کرتی ہوئی جھاگ سی پشم کے اوپر اس کا تلوہ آہستہ آہستہ کپکپانے لگا۔ اس نے سہم کو ریاض کو دیکھا اور اس کی آنکھوں میں آنسو آ

گئے۔

"ریاض ——" اس نے بند ہوتے ہوئے گلے سے کہا۔

"چلو اب تمہیں سوئمنگ پول دکھاؤں۔" وہ لاپروائی سے اٹھ کر چل پڑا۔

"بس کرو ریاض ——" وہ چیخی: "خدا کے لیے ——" پھر اس نے جلدی سے جوتا پہنا اور الٹے پاؤں بھاگ کھڑی ہوئی۔ ریاض اس کے پیچھے لپکا۔ ڈرائنگ روم میں پہنچ کر وہ ٹھٹک کر رک گئی۔

"جال" ریاض نے پوچھا: "تمہاری طبیعت ٹھیک ہے؟"

"ٹھیک ہے ریاض۔" وہ آنسو خشک کر کے مسکرائی: "تمہارا مکان بڑا خوبصورت ہے۔" اس نے دل میں ہلکی سی شرمندگی محسوس کی۔

ریاض اداسی سے ہنسا: "میں نے ملک ملک گھوم کر وہاں کی بہترین چیزیں جمع کی ہیں جال۔ وہاں کے بہترین آدمیوں کے برابر بیٹھا ہوں اور دنیا کی خوبصورت ترین عورتوں سے ملا ہوں' اور تمنے ——" وہ ایک لمحے کو رکا: "تم نے آج تک مجھے ہاتھ تک لگا کر نہیں دیکھا۔ جیسے میں کوئی اچھوت ہوں ——" آخری لفظ کانپتا ہوا اس کے ہونٹوں سے نکلا اور وہ اپنے جذبات کو چھپانے کے لیے ایک دم پلٹ کر دیوار کے ساتھ پڑی چھوٹی سی میز کے برابر جا کھڑا ہوا اور لرزتی ہوئی انگلیوں سے راکھ دانی گھمانے لگا۔ جمال نے بے خیالی سے ادھر ادھر دیکھا۔ باہر برآمدے میں گڈو منہ سے "زوم —— زوم" کی آوازیں نکالتا ہوا اپنی کتاب کو ہوا میں اڑاتا پھر رہا تھا۔ کمرے کے آر پار چلتی ہوئی ہوا میں حدت آ چلی تھی۔ فٹ پاتھ پر ابھی تک لڑکے کرکٹ کھیل رہے تھے۔ ریاض کی پولو شرٹ' جو کبھی اس کے جسم پر پھنس کر آتی تھی' اب ڈھیلی ڈالی اس کی پشت پر لٹک رہی تھی۔ پیچھے سے دیکھنے پر وہ پتلی سی گردن اور ابھری

ہوئی کندھوں کی ہڈیوں والا نوعمر لڑکا دکھائی دیتا تھا۔ اس وقت وہاں کھڑے کھڑے
اسے دیکھتے ہوئے جمال کے دل میں اس کے لیے بے پناہ رنج پیدا ہوا۔ وہ آہستہ
آہستہ چلتی ہوئی اس کے برابر جا کھڑی ہوئی۔ وہ دونوں ہاتھ میز پر رکھ کر ذرا سا
جھکا، ٹکٹکی باندھے دیوار پر ایک چھوٹی سی تصویر کو، جس پر اس سے پہلے جمال کی
نظر نہ پڑی تھی، گھور رہا تھا۔ اب جمال نے دہل کر اس تصویر کو دیکھا۔ اس
چھوٹی سی پرانی تصویر میں دونوں دوست، شوکت اور ریاض، یونیورسٹی کی کسی
عمارت کے برآمدے میں کھڑے تھے۔ دونوں نے ایک سی سفید پتلونیں اور نیلی
سلک کی آدھے بازوؤں والی قمیضیں پہن رکھی تھیں اوور ایک دوسرے کی
گردن میں بازو ڈالے کھڑے کھلکھلا کر ہنس رہے تھے۔ برآمدے کی سیڑھیوں
پر رکھے ہوئے گملوں میں بے شمار پھول کھلے ہوئے تھے۔ یہ بہار کا موسم تھا۔
اس کے دل میں درد کی ایک تیز رو چلی اور سارے بدن کو کاٹتی ہوئی نکل گئی۔
زندگی میں ان دو مردوں سے اس کی نسبت رہی تھی۔ ایک سے اس نے محبت
کی تھی اور دوسرے کو عزیز دوست کی طرح چاہا تھا، اور بالآخر دونوں کو وقت نے
ضایع کر دیا تھا۔ اب بہار کا موسم اور ہنستے ہوئے نوجوان پھولوں کا زمانہ صرف
اس چھوٹے سے برومائیڈ پیپر پر منجمد ہو کر رہ گیا تھا اور یاد دلاتا تھا کہ زندگی میں
اس نے بہت کچھ پایا تھا مگر بہت زیادہ پانے کی خواہش کی تھی۔ اس نے ریاض
کے کپکپاتے ہوئے کندھے پر سر رکھ کر آنکھیں بند کر لیں اور اس کے دل نے
رو کر کہا: "تم کہاں ہو شوکی —— اب تم کہاں ہو؟"

وہ ریستوراں کے ہال میں بیٹھا ساحل کا نظارہ کر رہا تھا۔ ابھی ابھی وہ
کھانے سے فارغ ہو کر بیٹھا تھا اور بڈھا بیرا، جو اس کا دوست تھا، اس کے آگے
سے برتن لے کر گیا تھا۔ "اب سو مت جانا یہاں پر بابو۔" وہ میز صاف کرتے

ہوئے خوش دلی سے بولا تھا اور اس نے جواب دیا تھا: "بس ذرا ہی دیر میں یہاں
ٹانگیں پھیلا کر سونے والا ہوں، تم دیکھتے رہو۔" اور بڈھا بے دانت کا منہ کھول
کر ہنس دیا تھا۔" اب آسودگی کے ان چند لمحوں میں وہ خوشی سے میز پر انگلیاں
بجاتا ہوا باہر سطح سمندر پر ڈولتے ہوئے بگلوں کو دیکھ رہا تھا۔ ہال میں بڑی
رونق تھی۔ لوگ ایک ساتھ کھانا کھانے اور باتیں کرنے میں مشغول تھے۔ ایک
عجیب سا خواب آلود، دھیما دھیما شور چاروں طرف سے اٹھ رہا تھا۔ اس نے
یکے بعد دیگرے کئی ایک لمبی لمبی جمائیاں لیں۔ اب اسے نیند آ رہی تھی۔

پھر اس وقت ایک عجیب واقعہ ہوا۔ سمندری بگلوں کی ٹولی کی ٹولی پھڑپھڑا
کر اڑی اور پانی کے قطرے موتیوں کی طرح دھوپ میں چمکتے ہوئے ان کے
پروں سے اڑ اڑ کر سطح آب پر گرنے لگے۔ پھر یکایک ان میں کھلبلی مچ گئی۔ اس
نے ایک پرندہ دیکھا جو ان کے گرداگرد چکر لگا رہا تھا اور اس ساری افراتفری کا
سبب معلوم ہوتا تھا۔ یہ باز کی قسم کا پرندہ تھا جو اس علاقے میں پہلے اس نے
کبھی نہیں دیکھا تھا: "یہ کہاں سے آیا ہے!" اس نے اچنبھے سے سوچا۔ پھر
اچانک اس پرندے نے پر سمیٹ کر گولی کی رفتار سے ہوا میں ایک غوطہ لگایا اور
بگلوں کی ٹولی پر جھپٹتا ہوا نکل گیا۔ نازک بدن آبی جانور اپنی چھوٹی چھوٹی آوازوں
میں شور مچا مچا کر پاگلوں کی طرح ادھر ادھر اڑنے لگے۔ پرندہ پلٹ کر پھر ان پر
جھپٹا اور دوسری طرف نکل گیا۔ اتنے فاصلے پر ہونے کے باوجود اس نے صاف
طور پر اس کے جھپٹتے ہوئے تیز رفتار شہپروں کو اور تیز شکاری آنکھوں کو دیکھا
اور اس کے چہرے پہ رنگ اور آنکھوں میں وہ ناچتی ہوئی چمک لوٹ آئی۔ پھر
دیکھتے ہی دیکھتے وہ ہر دم یورش کرتی ہوئی سبزی مائل زہریلی نیلگوں دھند جیسے
دھوپ میں بخارات بن کر اڑ گئی اور پیچھے سفید ریتلا ساحل اور جھاگ اڑاتا ہوا
سمندر اور ہر طرف پھیلی ہوئی روشن دھوپ اور وسیع و عریض اجلا آسمان رہ گیا

اور فضا کے سنہرے زرد رنگ میں ایک ایک شے بڑی واضح اور روشن اپنی اپنی جگہ پر عین ٹھیک ٹھیک نظر آنے لگی اور اس کا دل جیسے ایک دم ہلکا سا ہو گیا۔ اس نے جیب میں ہاتھ ڈال کر ساری نقدی نکالی اور اسے میز پر رکھ دیا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ اب بگلے کہیں غائب ہو چکے تھے اور پرندہ پلٹنا جھپٹنا چھوڑ کر آسمان پر فتح کے چکر لگا رہا تھا۔

—— "یہ سب تمہارے ہیں۔" وہ بڈھے بیرے کے کندھے پر ہاتھ رکھ خوشی بولا: "اب میں جاتا ہوں۔" —— جب وہ ہال کے دروازے سے باہر آیا تو پرندہ اپنے بڑے بڑے پنکھ پھیلائے بڑی آزادی اور لاپروائی سے گہرے پانیوں کی طرف پرواز کر رہا تھا۔ وہ اس پر نظریں جمائے سحر زدہ سا اس کے پیچھے پیچھے چل پڑا۔

پھر ڈائننگ ہال میں بیٹھے ہوئے سب مرد عورت اٹھ اٹھ کر دروازوں اور کھڑکیوں پر جمع ہونے لگے۔ خوفزدہ ہاتھوں سے دیواروں اور کھڑکیوں کو تھام کر انہوں نے اسے گھٹنوں گھٹنوں، کمر کمر پانی میں اترتے ہوئے دیکھا اور دیر تک دم سادھے کھڑے رہے۔

"یا میرے اللہ ——" پھر کسی نے دہشت زدہ آواز میں کہا۔ ہال میں کہیں ایک پلیٹ کے گر کر ٹوٹنے کی آواز بلند ہوئی۔ سہ پہر کا سناٹا شدید ہو گیا —— دم بخود ہجوم میں دو عورتیں چپکے چپکے سسکیاں لے کر رونے لگیں۔

پھول کا بدن

"اور" لڑکی نے پوچھا۔

"اونہوں۔"

"ایک پیالی اور۔"

"نہیں۔ شکریہ۔"

"ایک تو اور۔"

"ارے نہیں بھئی ——" اس نے تنگ آ کر کہا: "تم جانتی ہو میں زیادہ چائے نہیں پیتا۔"

"نہیں۔"

"نہیں کیا۔"

"میں نہیں جانتی۔"

"کیا؟"

"میں آپ کے بارے میں کچھ نہیں جانتی۔"

"ایں؟" وہ ہکا بکا رہ گیا۔

وہ اس لڑکی کو ایک مدت سے جانتا تھا۔ وہ اس کے گھر والوں کو اور شوہر کو اور سب کو اتنی اچھی طرح سے جانتا کہ ان کے گھر کا ایک فرد تصور کیا جاتا

تھا۔ اور اتنی مدت سے جانتا تھا کہ اسے ٹھیک سے یاد بھی نہ رہا تھا' شاید اس
وقت سے کہ جب وہ اور اس کے کنبے کا بڑا لڑکا سکول میں پڑھا کرتے تھے' اور
دونوں کی کسی بات پر لڑائی ہو گئی تھی اور دونوں کو سزا ملی تھی' چھٹی کے بعد تک
ایک تختی لکھتا رہا تھا اور دوسرا سکول کے پودوں کو پانی دیتا رہا تھا' اور بعد میں
گلے میں بستے لٹکائے دونوں بظاہر ایک دوسرے سے بے خبر' آگے پیچھے چلتے
گھروں کو لوٹے تھے۔ پھر ایک دن کے بعد دونوں کی کسی بات پر صلح ہو گئی تھی
اور دوستی کا آغاز ہوا تھا۔ اس وقت وہ دوسری جماعت میں پڑھتے تھے' یا شاید
اس سے بھی پہلے سے ——— جب ساتھ والے گھر میں نئے لوگ آئے تھے اور
وہ دن بھر ان کے دروازے پر کھڑا مردوں عورتوں اور بچوں کو اندر باہر آتے
جاتے اور سامان کو منتقل ہوتے اور دروازے کھڑکیاں چٹاخ پٹاخ کھلتے' بند ہوتے
اور گرد کے بادلوں کو اٹھتے ہوئے دیکھتا رہا تھا' وہ صرف دوپہر کا کھانا کھانے کے
لئے گھر گیا تھا اور پھر بھاگ کر وہاں آ کھڑا ہوا تھا اور دیکھنے لگا تھا ——— بچوں کی
ماں نے ایک بار اس سے پوچھا تھا کہ وہ کہاں رہتا ہے اور وہ چپ چاپ کھڑا
دیکھتا رہا تھا۔ پھر عورت نے اسے اندر آنے کے لیے کہا تھا اور وہ اس پر بھی ٹس
سے مس نہ ہوا تھا اور نہ بولا تھا۔ عورت اس سے اکتا کر اندر چلی گئی تھی۔ اس
کے بعد وہ کئی روز تک دور دور سے بچوں کو دیکھتا اور ان سے مانوس ہوتا رہا تھا۔
اسے اچھی طرح سے یاد بھی نہ رہا تھا کہ کب سے ———

"تم جانتی ہو ———" اس نے کہا: "اچھی طرح سے جانتی ہو۔"

"نہیں۔"

اور پہلی بار' تقریباً پہلی بار' اسے اس قدر ضدی' سرکش اور قطعی لہجے
میں بات کرتے ہوئے دیکھ کر اس نے کئی بار آنکھوں کو جھپکا اور پھر انہیں پھیلا
کر سامنے بیٹھی ہوئی اس لڑکی کو پہچاننے کی کوشش کی۔

شام ہو رہی تھی اور کسی نے اٹھ کر بتی نہ جلائی تھی۔ دھندلکے کی نرم
اور معدوم روشنی میں سفید چینی کے چائے کے برتن جھلملا رہے تھے اور وہ ان
پر جھکی ہوئی بیٹھی تھی۔ اس کا ایک ہاتھ خالی پیالی میں چمچہ گھما رہا تھا اور دوسرا
گود میں پڑا تھا اور اس کا سیاہ اور گھنے بالوں والا سر اس کی نظر کے سامنے تھا۔
اس کی آنکھوں میں کاجل اور ہونٹوں پر سرخی نہیں تھی ——— یہ سوچ کر کہ وہ
اس لڑکی کو اتنے عرصے سے جانتا ہے' اس کے دل میں ایک بے نام سی افسردگی
کا احساس پیدا ہوا۔

"میرا نام نعیم ہے۔" اس نے کہا۔

"اچ ——— چھا؟" لڑکی نے چہرہ اٹھایا جو مجسم تمسخر تھا۔

"تمہارا نام ثروت ہے۔"

"ٹھیک؟"

"پھر؟"

"پھر کیا؟""

اس نے کچھ اس طرح سے "پھر" کہا کہ وہ گویا بجلی کا جھٹکا لگنے سے اٹھ
کر بیٹھ گیا۔ اب ایک نامعلوم' لاچار غصہ اس کے دماغ کو چڑھنے لگا۔ کمرے میں
تاریکی تیزی سے بڑھتی جا رہی تھی۔ کھڑکی کے راستے ایک گزرتی ہوئی موٹر کی
روشنیاں ایک لمحے کے لئے ان کے چہروں پر پڑیں اور غائب ہو گئیں۔

"اٹھ کر بتی جلاؤ۔" اس نے کہا۔

"نہیں۔"

"بتی جلاؤ۔" اس نے پھر کہا۔

"اندھیرا اچھا ہے۔" لڑکی کی گہری' مختصر ہنسی کی آواز آئی۔

اگر وہ اس لب و لہجے کا' اس رویئے کا اس سے ذرا بھر بھی متوقع ہوتا تو

شاید اپنا دماغ نہ کھوتا، جب وہ بتی جلانے کے لئے اٹھا تو گھٹنے کی ٹھوکر سے چائے کی میز الٹ گئی۔ بعد میں وہ اسی ایک واقعہ سے ـــــ یا کسی ایک واقعہ سے ـــــ یعنی ایک اوندھی پیالی اور تھوڑے سے دودھ اور تھوڑی سی چائے اور تھوڑی سی شکر کو فرش پر بکھرے ہوئے دیکھ کر یا شاید لڑکی کو اسی طرح چپ چاپ ہاتھ میں لئے خاموش اور خود مختار بیٹھے ہوئے پا کر یا شاید اس سے بھی پہلے، اندھیرے میں گرتے ہوئے برتنوں کے شور کو سن کر ہی ٹھنڈا پڑ گیا۔

"یہ تمہاری غلطی سے ہوا ہے۔" اس نے تھکے ہوئے لہجے میں کہا۔

"اندھیرے میں ـــــ" وہ بولی: "چیزوں کی شکل بدل جاتی ہے۔"

"کیسے۔"

"نظر کا راستہ رک جاتا ہے ـــــ" وہ پھر بولی: "پھر خیال چل نکلتا ہے۔"

"تمہارے سر میں کیا سما گئی ہے؟"

"ایک فائدہ ـــــ" اس نے کہا: "اس سے اور ہوتا ہے: آنکھوں کو آرام ملتا ہے۔"

"تمہارا دماغ چل گیا ہے۔"

وہ آ کر کرسی پر ڈھیر ہو گیا۔ واقعے کے اچانک پن نے اسے دفعتاً بہت زیادہ تھکا دیا تھا۔ اتنا عرصہ ہو گیا تھا اور ہمیشہ اس لڑکی کی موجودگی میں، محض اس کے کہیں آس پاس ہونے کے خیال سے ہی ہمیشہ اس کو بڑی سلامتی اور مہربانی اور فراغت کا احساس ہوتا تھا۔ اس لڑکی میں کوئی ایسی جان لیوا کشش نہ تھی جو دنیا کی ساری اور لڑکیوں میں، دور و نزدیک، جان انجان، اور نام بے نام کی اکو ایک لڑکی میں تھی، جس کی وجہ سے کہ اس نے ایک عمر تک ایسے ایسے لاحاصل دکھ اٹھائے تھے کہ اکو ایک لڑکی سے ایک عمر تک وہ بیک وقت خوف زدہ اور

مسخر رہا تھا، اور ایک وقت آیا تھا کہ اسے اپنی شخصیت کو ثابت و سالم رکھنا محال ہو گیا تھا اور وہ خدا کی پیدا کی ہوئی ساری مخلوق میں سب سے خوشنما اور عمیق اور مکمل خلق ـــــ جوان عورت ـــــ سے بھاگا بھاگا پھرتا تھا۔ اس کو وہ سارا وقت یاد تھا، جب تک کہ اس کی شادی نہیں ہو گئی تھی، تب تک اس کو یہ بھی یاد تھا کہ گھوم پھر کر وہ ایک جگہ جہاں امن اور سلامتی اور مہربانی کا احساس ہوتا ہے اور وہ ایک جگہ جہاں وہ اپنی عمر و نظر کی بلوغت اور کھویا ہوا اعتماد دوبارہ حاصل کر سکتا ہے اور مکمل اور بے خطر آزادی نفس کے ساتھ رہ سکتا ہے، اس لڑکی کے آس پاس تھی ـــــ وہ اس کو ایسی اچھی طرح سے جانتا تھا۔

"آج تم ہر ایک سے لڑنے پر تلی ہوئی ہو۔" اس نے کہا۔

"نہیں ـــــ" وہ بولی: "صرف آپ سے"

"تم محمود سے بھی لڑ کر آئی ہو۔"

"محمود میرا شوہر ہے۔"

"پھر؟"

"یہ میرا ذاتی معاملہ ہے۔"

"میں تمہارے ذاتی معاملے میں شامل نہیں ہوں؟"

"نہیں۔"

"کیا؟"

"آپ میرے ذاتی معاملے میں شامل نہیں ہیں۔"

"ایں؟"

"ہاں۔"

"اوہ ـــــ" وہ غصہ دباتے ہوئے بولا: "کیا ہی اچھا ہوتا اگر یہ سچ ہوتا۔"

”آپ میری کسی چیز میں شامل نہیں ہیں۔“

”تو پھر مجھ پر ایک مہربانی کرو: اس بات کا سب لوگوں میں اعلان کردو۔“

”کیوں؟“

”میں تمہارا روز روز کا جھگڑا چکاتے ہوئے تنگ آ گیا ہوں۔“

”جھگڑے میں آپ خود پڑے ہیں۔“

”کیسے؟“

آپ نے میری شادی کرائی تھی۔

”تو میں ——— اس کا قصوروار ہوں؟“

آپ اس میں شریک ہیں، بہرحال۔“

”میں قصوروار ہوں؟“ اس نے حیرت سے پھر پوچھا۔

”میں کچھ نہیں جانتی۔“

اتنے تھوڑے سے وقت میں اتنی ساری غیر متوقع باتیں ایک ساتھ واقع ہو گئی تھیں کہ اس کے ذہن کا وہ چمچماتا ہوا تیز حصہ جوان کے صدمے کو درج کرتا ہے، ایک دم کند ہو گیا۔ وہ ساری باتوں کو چھوڑ کر دفعتاً فرش پر پھیلے ہوئے دودھ اور چائے اور شکر کے بارے میں سوچنے لگا۔ بڑی آسانی سے اٹھ کر چائے کے برتن اکٹھا کرتے اور انہیں طشتری میں رکھتے اور اوندھی میز کو کھڑا کرتے ہوئے اس کے اوپر گیلے قالین اور ٹوٹی ہوئی پیالی کا پورا المیہ اپنی تمام تر شدت اور مضحکہ خیزی کے ساتھ واضح ہو گیا۔ یہ لڑکی جو اس کے سامنے ایسی ٹھوس خود مختاری کے ساتھ بیٹھی تھی، اور جو چاہتی تھی کر رہی تھی، جو چاہتی تھی کہہ رہی تھی ——— وہ ہمیشہ سے کہتی آئی تھی، اور ہمیشہ میں تیس سال سے اوپر کا عرصہ آتا تھا ——— وہ اسے خالی چینی کی پیالی کی مانند نازک اور بے زبان اور غیر محفوظ معلوم ہوئی تھی، وہ اسے ایک عمر سے جانتا تھا، اور ایک عمر

کے اندر وہ سارے زمانے آتے ہیں جو کسی کو جاننے کے لئے ضروری ہوتے ہیں، سب سے بڑا لڑکپن کا زمانہ جب ہمجولیوں کے ساتھ کھیلتے ہیں اور اتنا طول طویل کھیلتے ہیں کہ دیر سویر کی خبر نہیں رہتی اور دور دراز ایسی ایسی جگہوں پر کھیلتے ہیں جو کسی کے علم میں نہیں ہوتیں اور ایسا ایسا گہرا کھیلتے ہیں کہ ایک دوسرے کی بوباس کے واقف ہو جاتے ہیں، آنے والے سارے زمانوں پر اس زمانے کی ایسی چھاپ لگ جاتی ہے کہ پھر عمر میں جب بھی کبھی کسی ایسے وقت یا ایسی جگہ میں سے اتفاقیہ گزر ہوتا ہے جو ان جگہوں سے ان چہروں سے، ان ناموں سے بلکہ ان گمشدہ آوازوں تک سے اور کبھی کبھی تو محض کسی بازو، کسی ہاتھ کے اس واحد، نامکمل اشارے اور کسی آنکھ کی اس مخصوص لمحاتی چمک سے ہی ذرہ بھر کا بھی میل کھاتی ہے جن سے کبھی آشنائی رہ چکی ہوتی ہے تو ذہن چشم زدن میں سارا فاصلہ طے کر کے وہاں جا پہنچتا ہے اور لوٹ بھی آتا ہے، لڑکپن کے زمانے کا ایک ایک لمحہ عمر بھر کا احاطہ کرتا ہے ——— اور وہ اس لڑکی کو اس زمانے سے جانتا تھا۔

”میں تنگ آ چکا ہوں۔“ اس نے کہا۔

”کس بات سے۔“

”تمہارے جھگڑوں سے۔“

”آپ سے کس نے کہا تھا ———“

”کیا؟“

”——— کہ جھگڑے میں پڑیے۔“

”مجھ پہ لازم آتا تھا۔“

”کیسے؟“

”ایسے کہ میں ——— کہ میں تمہارا ——— ہنہ ——— ہنک!“

"کہئے' کہئے ——— آپ میرے کیا؟"

"میں تمہارے گھر کا ایک فرد ہوں' تقریباً۔"

"میرے گھر کے فرد اور بھی ہیں۔"

"اور اس لئے بھی کہ میں تمہاری شادی کرانے کا ذمہ دار ہوں۔"

"آپ سے کس نے کہا تھا؟"

"ہنک ——— لاحول ولا قوہ ——— تمہاری گھر والوں نے کہا تھا بھئی۔"

"میں نے تو نہیں کہا تھا۔"

"تم نے ——— اور ——— تمہیں تو پتا ہی تھا۔"

"آپ نے مجھ سے پوچھا تھا؟"

"اس سے بھلا ———"

"——— کیا فرق پڑتا ہے؟ ٹھیک ہے نا ———!"

اور عمر بھر کے علم کی بنا پر وہ کہہ سکتا تھا کہ اس لڑکی نے آج تک کسی موقعہ پر کبھی شخصی طور پر' ذاتی سطح پر ایسی بات نہیں کی تھی۔

"آپ آپ آپ ———" اس نے کہا: "یہ کیا گردان لگا رکھی ہے تم نے۔ سیدھی طرح سے بات کرو۔"

"آپ آپ آپ ——— بالکل ٹھیک ہے ——— آپ۔"

"اوو ———" اس نے حلق سے گہری کربناک' بیزار کن آواز پیدا کی۔

"اچھا تم ———" وہ مسکرائی: "تم ——— ٹھیک ہے؟"

"اوو ———"

یہ حیرت کی بات تھی' اس لئے کہ اس کو وہ وقت یاد تھا۔ وہ عمر کے اس دور میں سے گزر رہا تھا جب وہ ہر سمت کا احساس کھو چکا تھا' اور شاموں کو غیر آباد سڑکوں پر گھنٹوں اکیلا پھرتے رہنے کے بعد ان کے گھر آ کر کرسی پر ڈھیر ہو

جایا کرتا تھا' کبھی کبھی جب ہمسائیگی کی ——— دلوں کی ہمسائیگی کی ——— خواہش شدید ہو جاتی تھی' اور وہ گھر میں اکیلی ہوا کرتی تھی تو وہ سر اٹھا کر کوئی نہ کوئی بات کیا کرتا تھا۔ ثروت! تم کو پتا ہے' میں کہاں کہاں سے ہو کر آیا ہوں۔" یا "یہاں آ کر مجھ سے باتیں کرو بھئی ——— میں تھک گیا ہوں۔" یا "تم ہر وقت کام میں کیوں لگی رہتی ہو' باؤلی!" اور وہ اپنی آہستہ رو' غیر جانبدار مصروفیت میں لگی اپنی کسی حرکت سے' کسی بات سے فوراً اس کو اس پرامن سطح پر لے آتی تھی جس کا وہ متلاشی ہوتا تھا ——— پھر اس کے بعد وہ وقت جب اس کی شادی ہوئی تھی اور اس نے آ کر پوچھا تھا: "ثروت' بلقیس تم کو کیسی لگی؟" تو جواب میں بولی تھی: "بڑی اچھی لگی بھابی بہت اچھی لگی ———" وہ ایسے لہجے میں بولی تھی جو اس کو آج تک یاد تھا اور جسے محسوس کر کے اس کا لہو سرد پڑ جاتا تھا' اس لیے نہیں کہ اس میں کوئی حسد یا کوئی رنج تھا اس لئے کہ اس میں مشین کی سی یکسانیت تھی جو اس کے لئے غیر متوقع تھی ——— پھر اس کے بعد وہ وقت جب اس کی بیوی نے وفات پائی تھی (ماں کے بعد دنیا بھر میں صرف بیوی ہی ایک ایسا بشر تھی جس کے وہ کسی حد تک قریب آ سکا تھا) وہ اس حادثے میں یکسر کھو کر رہ گیا تھا اور ایک روز اس کے پاس بیٹھا بیٹھا بول اٹھا تھا: "بی بی' کچھ تم ہی بتاؤ۔" اور اس نے جواب میں کہا تھا: "صبر کرو۔" اور وہ ان دو لفظوں کو جو ساری دنیا نے اس کے سامنے دہرائے تھے اور جن میں ساری دنیا کی سرد مہری اور لاتعلقی بھری ہوئی تھی' آخر اس کی زبان سے بھی نکلتے سن کر وہ سخت رنجیدہ ہو گیا تھا ——— وہ وقت اور اس سے پہلے اور اس کے بعد کے بہت سے وقت' درحقیقت اسکو بہت سے زمانے یاد تھے جن میں کہ وہ برابر کی شریک تھی۔

"تم سے ایسی باتوں کی توقع نہیں تھی بی بی۔" اس نے کہا۔

"بی بی —— بی بی ——" وہ پھٹ پڑی: "بی بی ——"

"ایں؟"

"جیسے میں بھیڑ ہوں یا بکری ہوں یا کیا ہوں —— جس کا کوئی نام نہیں' کوئی کام نہیں —— جس کا ——"

"ثروت!"

"ہاں' یہ ٹھیک ہے —— ثروت —— یہ میرا نام ہے۔"

"ثروت!!"

"تم نے عمر بھر مجھے کوئی نام نہیں دیا کبھی —— میرے وجود تک کو تسلیم نہیں کیا کبھی —— مجھے کچھ بھی نہیں سمجھا —— کچھ بھی نہیں ——"

"کچھ بھی نہیں۔" اس کا منہ کھلا رہ گیا۔

"میرے نام کو تم پکارتے رہے ہو اور برابر بے خبر رہے ہو' برابر۔"

"کس سے بے خبر رہا ہوں؟"

"مجھ سے ——" وہ چیخی: مجھ سے!"

"میں کچھ سمجھا نہیں ثروت۔"

تم نے کبھی محسوس نہیں کیا کہ میں بھی کوئی ہوں' تمہاری طرح' دوسروں کی طرح' ایک انسان —— اور دیکھتی بھالتی ہوں' سوچتی ہوں' محسوس کرتی ہوں' کوئی وجود رکھتی ہوں' جیسے ہر کوئی رکھتا ہے' جیسے تم رکھتے ہو۔"

"مگر ثروت —— میں ہمیشہ تمہارا ——"

"ہمیشہ میرا خیال رکھتے رہے ہو؟ ٹھیک ہے۔ ہمیشہ میرے آس پاس رہے ہو؟ ٹھیک ہے۔ مجھ سے اتنے مانوس' اتنا قریب رہے ہو؟ یہ بھی ٹھیک ہے مگر کتنے بے تعلق رہے ہو!"

"سراسر غلط ہے' سراسر —— تم بے تعلق رہی ہو ——"

"میری بدقسمتی یہ ہے نعیم کہ تم مجھے اس وقت سے جانتے ہو جب میں ایک کرتہ پہن کر ننگے پاؤں گلیوں میں بھاگا کرتی تھی اور تم مجھے بالوں سے پکڑ کر گھسیٹا کرتے تھے —— تم مجھ سے اتنے مانوس' اتنے غافل تھے —— اور ہمیشہ رہے ہو —— اور میں اسی مانوسیت کے حجاب میں عمر بھر لا تعلق بنی رہی ہوں۔"

"غلطی تمہاری تھی۔"

"غلطی نہیں' مجبوری۔"

یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی ——" اس نے کہا: "بچپن کی دوستی کا نتیجہ اس طرح کیسے نکال رہی ہو!"

بچپن کی دشمنی کا تو کوئی نتیجہ نہیں نکلتا —— دشمنی نادانی ہوتی ہے' دوستی ظلم ہوتی ہے —— میری طرف دیکھو' اوپر سے نیچے تک دیکھو —— تم نے آج تک نظر بھر کر میری طرف نہیں دیکھا —— میں ایک عورت ہوں' ایک مکمل شخصیت ہوں —— تمہیں کبھی اس کا خیال آیا ہے؟"

"میں کبھی تم سے غافل نہیں رہا۔"

"درست ہے —— تم ہمیشہ میرے بارے میں بڑے باخبر رہے ہو' اسی طرح جیسے اس کرسی یا اس میز یا اس کھجور کے پیڑ کے بارے میں باخبر رہے ہو —— کبھی تم نے آج تک مجھ کو وہ سمجھا ہے جو میں ہوں؟"

"میں نے ہمیشہ تم کو ثروت سمجھا ہے' جاوید کی بہن' ایک نہایت عزیز ہستی' ایک معقول شریف لڑکی ——"

"معقول شریف لڑکی ——" وہ ہوا میں ہاتھ پھینک کر بولی: "تمہیں پتا ہے اس کا مطلب؟ جہاں ہم رہتے ہیں وہاں معقول شریف لڑکی اللہ میاں کی

گائے ہوتی ہے جس کی کوئی حیثیت نہیں ہوتی، جو حیوان مال ہوتی ہے، جو محض فرض کرلی جاتی ہے، محض قبول کرلی جاتی ہے اور نظرانداز کردی جاتی ہے اور مستقل نظرانداز کی جاتی ہے، مستقل۔"

"تم خواہ مخواہ مبالغے سے کام لے رہی ہو، ذرا ٹھنڈے دل سے سوچو ——"

"عمر بھر کی پس و پیش کے بعد دل ٹھنڈا نہیں رہتا اور نہ سوچ رہتی ہے —— تم لوگ ہمارے ساتھ ایسا خراب سلوک کرتے ہو ——"

"ہم لوگ؟"

"ہاں ——" وہ بولی: "تم لوگ۔"

"اوہ ثروت ——" اس نے تھکے ہوئے لہجے میں کہا: "اس میں میرا کیا قصور!"

"تمہارا قصور ——" وہ بولی: "محمود تمہارا دوست تھا اور تم نے میری شادی ٹھہرائی تھی —— تم مجھ سے پوچھ نہیں سکتے تھے؟"

"پوچھنے کے لئے تمہارے گھر والے جو موجود تھے۔"

"گھر والے ——" وہ بولی: "گھر والے کیا ہیں —— وہ تو محض گھر والے ہیں۔"

"کیا مطلب؟"

"گھر والے اہم نہیں تھے —— اہم تم تھے۔"

"کیسے؟"

"میرے لئے۔"

"ثروت ——" وہ جیسے زندگی میں پہلی بار چونک اٹھا ہو: "میں تمہارا مطلب نہیں سمجھا۔"

پھر وہ اس کی خاموش، بیباک نظروں سے اپنا جواب حاصل کرکے کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا اور ندامت سے ادھر ادھر دیکھنے لگا۔

وہ اٹھ کر کمرے میں پھرنے لگی۔

"نعیم، عورتوں میں بڑا صبر ہوتا ہے اور بڑی شرم ہوتی ہے، اتنی کہ میں اب تک آنکھ ملا کر تم سے بات نہیں کرسکتی تھی —— لیکن اب وہ وقت آ گیا ہے کہ جب آدمی، عورت ہو کہ مرد، اتنا کچھ بھگت چکا ہوتا ہے کہ نہ شرم رہتی ہے نہ صبر —— میں بتیس برس کی ہو چکی ہوں اور میں نے زندگی کی ساری ڈھکی چھپی شکلوں کو دیکھ لیا ہے۔"

"ثروت!"

"میں نے سمجھا تھا کہ دنیا بہت بڑی ہے، اس میں پیٹ کے مسئلے ہیں اور ہر روز کی زندگی کے جو بہت اہم ہیں —— میں سب کچھ بھول جاؤں گی —— عورت اپنا سربلند رکھنے کے لئے آخر دم تک اپنے آپ کو اور دوسروں کو دھوکا دیتی رہتی ہے، یہ مت سمجھو کہ میں محمود کو کسی بات کا ملزم ٹھہرا رہی ہوں، میرا شوہر بہت اچھا آدمی ہے، اس نے کبھی مجھے دکھ نہیں دیا ——"

وہ اٹھ کھڑا ہوا، لیکن پھر بیٹھ گیا۔

وہ کمرے میں پھرتی رہی: "دس سال کا عرصہ گزر گیا ہے اور میں آج تک اس سے کھل کر بات نہیں کرسکی —— یقین جانو، میں نے کوشش کی ہر روز، ہر رات ——"

"خدا کے لئے چپ رہو۔"

"ہر رات، ہر ہر لمحے مجھے احساس رہا ہے کہ کہیں نہ کہیں، کسی نہ کسی وقت، کوئی نہ کوئی شے، بہرحال کھوئی گئی ہے، چھٹ گئی ہے، ضائع ہو گئی ہے —— اس کی کھٹک میرے دل میں برقرار رہی ہے ہمیشہ ہمیشہ —— وہ شے

جس کے چھٹ جانے سے انسانوں کے درمیان دیانت داری ختم ہو جاتی ہے ------ پھر ایک روز جب سانس بھی سینے میں رکنے لگتی ہے تو دل میں خیال آتا ہے کہ یہ سب اس قدر فضول ہے، فضول، فضول، لاحاصل ------"

"ثروت بیگم ------" اس نے کہا: "زندگی کی گاڑی کو اب موڑا تو نہیں جا سکتا۔"

"مگر اس دکھ کو تو ختم کیا جا سکتا ہے۔"

"کیسے؟"

"نعیم ------" وہ بولی: "میرے حلق میں ایک پھانس ہے۔"

"مگر میں کیا کر سکتا ہوں؟"

"مجھے آزادی چاہیے۔"

"کیسے ------" وہ چیخ کر بولا: "کیسے؟"

پھر اس کی خاموش بے باک نظروں اور ہوا میں پھیلے ہوئے، بولتے ہوئے، فریاد کرتے ہوئے مایوس، بے حجاب ہاتھوں کو دیکھ کر وہ سن رہ گیا۔

جب رات آدھی سے زیادہ گزر چکی تو اس نے سوچا کہ محبت کی بھی بہت سی قسمیں ہیں: ایک وہ ہے جو ہمیں نادار کرتی ہے ------ مگر محبت آخر محبت ہے جو کچھ بھی اور کیسی بھی ہو، آدمی کو اپنے آپ سے الگ کرنے اور کہیں نہ کہیں پہنچانے پر حاوی ہے، بہر حال۔

جب رات ابھی شروع ہی ہوئی تھی تو اس نے صرف ایک سوال کیا تھا: "تم ہمیشہ ننگے بدن سوتی ہو؟" اور جواب میں وہ آہستہ سے بولی تھی: "شی ------" جیسے ماتمی مجلسوں یا مقدس مزاروں پر سوال کرنے والے بچوں کو چپ کرایا جاتا ہے ------ اور یوں یہ وہ واحد کلمہ ثابت ہوا تھا جو رات بھر میں اس کے منہ سے نکلا تھا، اور اس نے ذرا حیرت سے سوچا تھا کہ عورت کی بھی کتنی

مختلف قسمیں ہوتی ہیں: ایک تو یہ تھی جو آج کے دن تک اس کے لئے بے جنس و کشش رہی تھی، درحقیقت اس بلا کی جاندار اور روشن تھی کہ پل کے پل میں اس کو کہاں سے کہاں لے گئی تھی ---- جب عورت اور محبت کا میل ہوتا ہے تو ایک کرشمے کا ظہور ہوتا ہے جس کے واسطے سے، بلندی کا ہو کہ پستی کا ہو، زندگی کا ایک تجربہ ہوتا ہے جو عظیم اور معرکہ خیز ہوتا ہے، اس لحاظ سے کہ آدمی کو اپنی آپ سے الگ ہو کر زندگی کی بلند سے بلند اور پست سے پست شے کو، ایک لمحے کے لئے ہی سہی، ایک سطح پر، ایک نظر میں دیکھنے اور اس کو خود میں جذب کرنے اور پھر خود کو کائنات میں کھونے اور ساری جاندار اور بے جان چیزوں کے ساتھ ایک ہونے، ایک لمحے کے لیے ہی سہی، ایک ہونے اور اپنے آپ کو عظیم اور قوی اور لافانی ذات واحد خیال کرنے کی اہلیت بخشتا ہے ----- اس بات کا اسے علم ہوا تھا۔ وہ یہ سمجھے ہوئے تھا کہ اب تک وہ پیدائش سے لے کر شادی، اور شادی سے لے کر موت تک، زندگی کی ساری تاریخ اور ساری اونچ نیچ اور سارے دکھ اور ساری راحت سے آشنا ہو چکا ہے، اور اب کوئی بات، کوئی چیز بھی اسے چونکا نہیں سکتی ---- وہ یہ دیکھ کر حیرت زدہ رہ گیا تھا کہ وہ لمحہ، وہ ایک لمحہ جو اس کے سن بلوغت کو پہنچنے کے بعد ہزاروں بار اس پر آیا تھا اور کبھی پریشانی، کبھی پشیمانی اور کبھی محض لذت دے کر گزر گیا تھا، اس لمحے میں جب محبت شامل ہوتی ہے، اور عورت کے بدن کی ساری رضامندی شامل ہوتی ہے تو ناداری کا وہ عظیم لمحہ بھی آدمی کو قوت اور اختیار، اور لافانیت کے اس نشے، اور فنا فی الذات کی ان بلند گہرائیوں تک پہنچانے پر قدرت رکھتا ہے جہاں پہنچ کر وہ سرور اور طاقت کی آگ میں پگھل جاتا ہے اور پھیل کر ساری کائنات کو لپیٹ میں لے لیتا ہے اور سمجھتا ہے کہ اب وہ ہی وہ ہے، اور کچھ نہیں ہے، اور کچھ بھی نہیں ہے، جب بدن بدن سے خطاب کرتا ہے اور ہار جاتا ہے تو لہو

لہو سے ہمکلام ہوتا ہے' اور جب لہو سرد پڑ جاتا ہے' محبت جب بھی رہتی ہے' اچھے وقت کی یاد کی طرح جو دراصل اچھے وقت کی نسبت' جس کے واسطے سے کہ وہ ہوتی ہے' زیادہ خوش کن اور پائیدار ہوتی ہے لیکن جس کے وجود کے بغیر جو وجود میں نہیں آ سکتی' محبت' جب بدن بدن کا مخاطبہ انجام پاتا ہے اور لہو لہو سے مکالمہ ترک کرتا ہے' باوجود اور بدستور رہتی ہے مگر اپنا وجود بدن بدن کے اس رشتے سے حاصل کرتی ہے جو لہو کی گرمی پر قائم ہوتا ہے اور جس کے واسطے سے باقی سارے رشتے ہوتے ہیں' کہ ایک پھول جو اپنی زمین کی مرطوب حدت پر قائم ہوتا ہے' سب سے فی الواقعہ وجود ہوتا ہے اور گو کہ اس کی خوشبو لطیف تر اور حسین تر اور اعلیٰ تر ہوتی ہے اور حصے میں خانہ بدوش کی سی آزادی اور خود مختاری اور خود کلامی اور ہرن کی سی وحشت اور رفتار اور تفاخر لے کر پیدا ہوتی ہے' پھول کے بدن کے واسطے کے سوا کوئی واسطہ دنیا میں کسی سے اور کوئی وجود دنیا میں کبھی نہیں رکھتی بہرحال' اس بات کا اس کو علم ہوا تھا —— مگر اب وہ لمحہ گزر چکا تھا اور اب وہ اپنا فاتح اور پرسکون جسم بستر پر پھیلائے چاروں شانے چت لیٹا چھت کو گھورے جا رہا تھا۔ اس کی آنکھیں تاریکی سے مانوس ہو چکی تھیں اور تھوڑے تھوڑے وقفے پر وہ ایک چھچھلتی ہوئی بے دھیان نظر اس پر ڈال لیتا تھا جو اب اس سے منہ موڑ کر لیٹ گئی تھی اور دیوار کو تکے جا رہی تھی' اور اسکا لمبا تاریک بدن جس کو ڈھانپنے کی بھی اس نے تکلیف نہ کی تھی' مسلسل جھرجھرا رہا تھا اور وہ ہلکی ہلکی گہری اور ملفوف اور نامانوس آوازوں میں ہنسے جا رہی تھی' ہنسے جا رہی تھی' یا شاید روئے جا رہی تھی —— اس نے کئی بار چاہا کہ اٹھ کر دیکھے' یہ ہنسنے کی آواز تھی یا کہ رونے کی مگر کوشش کے باوجود ایک بازو' ایک انگلی تک نہ ہلا سکا اور اسی طرح اپنا فاتح پر سکون جسم بستر پر پھیلائے دل میں موت لئے پڑا رہا۔

یوں بتیس برس کی عمر پانے اور اس کے سرد و گرم سے گزرنے کے بعد اس کو ---- وہ جو دیوار کی طرف منہ کیے لیٹی تھی ----- آخر اس بات کی خبر ہوئی کہ دنیا میں آدمی اپنی قسمت کا لکھا یا اپنے کرموں کا پھل نہیں' صرف اپنی پیدائش کا صلہ پاتا ہے' جو خواہش پوری ہو جاتی ہے' اور وہ جو حسرت بن جاتی ہے' کوئی بھی ہمیں کچھ نہیں دیتی' صرف غریب کر جاتی ہے' دونوں کو ہم ایک ساتھ بھگتتے ہیں' کہ ایک بار دلوں کو ہمسائیگی ختم ہو جاتی ہے تو پھر جسم کی قربانی سے نہیں لوٹتی ----- شاید وہ رو رہی تھی' آخر کار۔

صبح ناشتے کی میز پر اس کے سامنے اس وقت تک بیٹھا رہا جب تک کہ اس کی ماں نے آ کر برتن نہ اٹھا لئے۔ متعدد بار اس نے بات شروع کرنے کی کوشش کی مگر الفاظ اس کی پکڑ میں نہ آئے۔

"ثروت۔" آخر اس نے کہا۔

"چلو چلیں ——" وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

"ثروت۔"

"چلو چلیں ——" وہ بولی: "اٹھو ——"

اس کی ماں کو سلام کر کے اور اسے ساتھ لے کر وہ باہر نکل آیا۔

"جاوید کا خط آیا ہے ——" وہ اسے بتانے لگی: "اگلے ہفتے آ رہا ہے۔ اب کے وہ اماں کو ساتھ لے جائے گا پھر گھر خالی ہو جائے گا۔ شاید بند کر دیا جائے یا کرائے پر دے دیا جائے —— آج دھوپ کتنی سرد ہے۔"

"ثروت۔"

"وہ دیکھو' دو لڑکیاں گر پڑی ہیں —— ایک سائیکل پر دو لڑکیاں کیوں چڑھتی ہیں؟"

"ثروت ——"

یوں بتیس برس کی عمر پانے اور اس کے سرد و گرم سے گزرنے کے بعد اس کو ---- وہ جو دیوار کی طرف منہ کیے لیٹی تھی ---- آخر اس بات کی خبر ہوئی کہ دنیا میں آدمی اپنی قسمت کا لکھا یا اپنے کرموں کا پھل نہیں، صرف اپنی پیدائش کا صلہ پاتا ہے، جو خواہش پوری ہو جاتی ہے، اور وہ جو حسرت بن جاتی ہے، کوئی بھی ہمیں کچھ نہیں دیتی، صرف غریب کر جاتی ہے، دونوں کو ہم ایک ساتھ بھگتتے ہیں، کہ ایک بار دلوں کو ہمسائیگی ختم ہو جاتی ہے تو پھر جسم کی قربانی سے نہیں لوٹتی ---- شاید وہ رو رہی تھی، آخر کار۔

صبح ناشتے کی میز پر اس کے سامنے اس وقت تک بیٹھا رہا جب تک کہ اس کی ماں نے آکر برتن نہ اٹھا لئے۔ متعدد بار اس نے بات شروع کرنے کی کوشش کی مگر الفاظ اس کی پکڑ میں نہ آئے۔

"ثروت۔" آخر اس نے کہا۔

"چلو چلیں ——" وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

"ثروت۔"

"چلو چلیں ——" وہ بولی: "اٹھو ——"

اس کی ماں کو سلام کر کے اور اسے ساتھ لے کر وہ باہر نکل آیا۔

"جاوید کا خط آیا ہے ——" وہ اسے بتانے لگی: "اگلے ہفتے آ رہا ہے۔ اب کے وہ اماں کو ساتھ لے جائے گا پھر گھر خالی ہو جائے گا۔ شاید بند کر دیا جائے یا کرائے پر دے دیا جائے —— آج دھوپ کتنی سرد ہے۔"

"ثروت۔"

"وہ دیکھو، دو لڑکیاں گر پڑی ہیں —— ایک سائیکل پر دو لڑکیاں کیوں چڑھتی ہیں؟"

"ثروت ——"

"شی ——"

"ثروت!"

"نہیں نعیم ——" وہ بے حد تھکے ہوئے لہجے میں بولی: "خدا کے لئے چپ رہو۔"

وہ چپ رہا، مگر برابر اس کو دیکھے گیا۔

"پیدل چلیں یا بس پر؟" وہ بولی۔

"جیسے تمہاری مرضی۔"

"پیدل چلتے ہیں۔ فاصلہ ہی کتنا ہے۔"

"ہاں۔ فاصلہ ہی کتنا ہے۔"

"بے سود!"

"ہونہ ——؟"

"سب بے سود ہے، بے سود۔"

"ایں؟"

"لاحاصل، فضول، فضول۔"

"نہیں ثروت، رکو، میری بات سنو ——"

"تم لوگ ہمارے ساتھ ایسا سلوک کرتے ہو ——" وہ بد دلی سے بولی: "میرا گھر آ گیا ہے۔"

وہ ٹھٹک کر رک گیا ---- جب وہ اس کے گھر کے دروازے کی طرف بڑھنے لگا تو وہ پلٹ کر کھڑی ہو گئی: "تم اب جاؤ۔"

"کہاں؟"

"جاؤ۔"

"مگر ثروت۔"

"نہیں نعیم ——" وہ بولی: اب تم جاؤ۔"

گھر کے اندر محمود صوفے پر بیٹھا اخبار پڑھ رہا تھا۔

وہ کرسی پر بیٹھ گئی' پھر اس نے اپنا سر کرسی کی پشت پر ٹیک دیا اور آنکھیں بند کر لیں۔

کچھ دیر کے بعد جب وہ دوپہر کے کھانے کی تیاری کر رہی تھی اور اس کا خاوند پاس بیٹھا اخبار پڑھ رہا تھا تو وہ کوشش کر کے مسکرائی اور بولی: "آج دفتر نہیں گئے؟"